اگست ۱۹۶۵ء

جلد ۶۳ — عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

آسان زبان میں اسلامی تعلیمات کا سلسلہ

از ابو سلیم محمد عبد الحیٔ

ایمان کی اہمیت

- ایمان کیا ہے ؟
- دین میں ایمان کی کیا اہمیت ہے ؟
- کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے ؟
- دین کا شعور اور ایمان و یقین بخشنے والی کتاب
- بچوں اور عورتوں کے لیے نہایت مفید کتاب

قیمت ۲ روپے

اسلام کی تعلیم

- اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی عقائد کیا ہیں ؟
- اسلامی عبادات کیسے انجام دی جائیں ؟
- ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟

—— اس کتاب میں ——

ان سوالوں کا اطمینان بخش جواب ملے گا

قیمت ۱/۷۵ روپے

دین کی حفاظت

- خواتین کی اصلاح و تربیت کیلئے بیش قیمت کتاب
- دین کی حفاظت و بقا کیلئے خواتین کی ذمہ داری
- فسادِ معاشرہ میں خواتین کو صحیح راہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تدابیر

قیمت ۱٫۷۵ روپے

دین کی خدمت

- دین کی خدمت کیوں کی جائے اور کیسے ؟
- اس کام کی ضروری شرائط کیا ہیں ؟
- غیر اسلامی نظام سے مومن کا تعلق ۔
- اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور ان کا حل ۔
- آسان اور شگفتہ اندازِ بیان ۔ قیمت ۲٫۲۵ روپے

دین کی باتیں

- دین کیا ہے اور کیا چاہتا ہے ؟
- اسلام کے بنیادی عقائد کیا ہیں ؟
- اسلام کی بنیادی عبادات اور انکی ضروری تفصیلات
- آسان اور عام فہم زبان میں

قیمت ۲ روپے

تبلیغ کی حکمت

- تبلیغ کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے ؟
- داعی کی ضروری صفات کیا ہیں ؟
- مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کیسے کیا جائے ؟
- دعوتِ دین پیش کرنے کا سلیقہ ؟

قیمت ۱/۲۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۶	ماہ اگست ۱۹۶۵ء	جلد ۶۳

سالانہ چندہ — دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور — قیمت فی پرچہ

سات روپے — ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور — ۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

حال میں حکومتِ مغربی پاکستان کے ایک محترم وزیر صاحب نے یہ ارشاد فرمایا:

"معاشرہ کی اصلاح و تطہیر کے لیے والدین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس امر کا اطمینان کریں کہ ان کے گھروں اور ماحول میں صحیح اسلامی اقدار اور روایات کا احترام ہوتا ہے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ نئی پود کو مذہب کے قریب تر لایا جائے اور ان میں اسلام کی سچی محبت کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ مذہب کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ حکومت اس امر کی خواہش مند ہے کہ ہمارے نوجوان مثالی کردار کے حامل بنیں تاکہ ہماری قوم کو اقوامِ عالم کی نظروں میں عزت و توقیر کا مقام حاصل ہو۔ ۔ ۔ ۔ ہماری تمام مشکلات اور معاشرتی خرابیوں کا حل اسلامی اصولوں اور پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات و اقوال پر عمل کرنے میں مضمر ہے۔ انہوں نے کہا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی فلاح اس میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔"

کتنی صحیح ہے یہ نصیحت اور کس خوبصورت انداز میں محترم وزیر صاحب کی زبان سے یہ ادا ہوئی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ وزیر صاحب کی اسلام سے گہری وابستگی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ صاحبِ موصوف اسلام ہی کو ایک صحیح نظامِ حیات سمجھتے ہیں۔ اُس کے اخلاقی ضابطوں کی پابندی میں اپنی اور اپنی قوم کی فلاح و کامرانی پاتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اُن کے نزدیک مشعلِ راہ

ہیں اور اس کی روشنی میں وہ اپنا سفرِ حیات طے کرنے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں لیکن کچھ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ انہی پاکیزہ خیالات کا پرچار کرنے والے اور اسلام کی تعلیمات میں اپنی اور قوم کی فلاح ڈھونڈنے والے وزیر صاحب کی ایک تصویر اخبارات میں شائع ہوئی ہے جس میں ایک نوجوان مغنّیہ سازندوں کے جھرمٹ میں بیٹھی مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے ارکان کے سامنے اپنے فن کا کمال دکھا رہی ہے، اور تصویر کے تعارف سے معلوم ہوا کہ یہ محفل خود انہی وزیر صاحب نے اسمبلی کے رفقاءِ کار کی میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے ترتیب دی تھی۔

ہماری عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ وزیر صاحب چنگ و رباب کے بارے میں حضور سرورِ کائنات کے ارشادات سے ناواقف ہوں گے۔ یا انہیں گانے بجانے والیوں کے نغموں سے لطف اندوز ہونے کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر معلوم نہ ہوگا۔ یا وہ ان حد بندیوں سے بے خبر ہوں گے جو دینِ حق نے حُسن و نظر کے درمیان قائم کر رکھی ہیں۔ وہ مسلم معاشرے کے ہی ایک معزز رکن ہیں۔ اس معاشرے کے عام احساسات اور اس کے اجتماعی ضمیر سے آخر وہ اتنے بے تعلق یا غافل کیسے ہو سکتے ہیں کہ انہیں اتنا بھی معلوم نہ ہو کہ اسلام عیش و عشرت کی ان محفلوں کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مسلم تو ایک طرف رہے غیر مسلم تک جانتے ہیں کہ سفلی جذبات کو بھڑکانے والے اس آرٹ کی ہر نوع کا اسلام شدید ترین دشمن ہے۔ وہ رنگ و آہنگ کی ہمت افزائی کرنے کے لیے نہیں آیا بلکہ اسے دنیا سے مٹانے کے لیے آیا ہے۔ وہ انسانی دل و دماغ پر اس کے اثرات کو بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کانوں کے راستے جسم کے اندر سرایت کرنے والی اس "شراب" کو انسانی اخلاق کے لیے اتنا ہی مضر سمجھتا ہے جتنا کہ حلق کے راستے جانے والی دُخترِ رز کو۔

وزیر صاحب نے اس دعوت کا اہتمام یقیناً کسی مجبوری کے تحت تو نہیں کیا ہوگا۔

انہوں نے محض اپنی اور اپنے دوستوں کی تسکینِ ذوق ہی کے لیے یہ بزم سجائی ہوگی۔ اسلام سے ان کی گہری عقیدت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اس نوعیت کی محفل آرائی کو دیکھتے ہیں تو ہم حیران ہوتے ہیں کہ اُن کے قول و فعل کے اس تضاد کی کونسی توجیہ کر کے اپنے دل کو مطمئن کریں۔ اگر وزیر صاحب اپنے قلب کی گہرائیوں میں واقعی اسلام کو ہی صحیح نظامِ حیات سمجھتے ہیں اور اس کی پیروی ہی میں اپنی اور اپنی قوم بلکہ پوری انسانیت کی نجات دیکھتے ہیں تو پھر راگ و رنگ کی محفلیں خود منعقد کرنا کیسا، انہیں تو ایسی برائیوں کے خاتمہ کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اگر وہ دل و جان سے طاؤس و رباب کی افادیت کے قائل ہیں اور بے حجاب خواتین کے نغموں کو معاشرے کے لیے مفید اور ضروری سمجھتے ہیں تو پھر ان کا لوگوں سے یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ وہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی اختیار کریں۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت کا دم بھی بھرے اور ان کی پیروی کو ہی دنیا اور آخرت کی بھلائی کا ذریعہ تسلیم کرے، لیکن دوسری طرف پورے ذوق و شوق سے اپنی سرپرستی میں ایسی محفلوں کے انعقاد کا اہتمام بھی کرے جو حضور سرورِ کائنات کے ارشادات کی عین ضد ہوں۔

قول و فعل کا یہی تضاد ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا روگ ہے جس نے اندر ہی اندر سے ہمیں بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلام ہمارے لیے اب کوئی رہنما اصول یا قوتِ فکر و عمل یا مشعلِ راہ نہیں رہا بلکہ اس کی حیثیت اب ہمارے نزدیک ایک سستے نعرے کی سی ہے جس سے یا تو ہم گرمیٔ محفل کا سامان کر لیتے ہیں یا پھر اپنی قیادت کی دکان چمکانے کا کام لیتے ہیں۔ یہ کوئی نصب العین، مقصدِ حیات یا ہماری غایت الغایات نہیں بلکہ ایک مفید ہتھیار ہے جس سے آڑے وقت میں ہم اپنے تختِ اقتدار کی حفاظت و پاسبانی کرنے میں مدد حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے محبت و عقیدت کے نہایت بلند بانگ دعووں کے باوجود اپنی عملی زندگی میں ہم اسے کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہونے دیتے اور عمل کے

میدان میں انہیں اقدارِ حیات سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں جن کا مغرب پرستار ہے۔

کسی مقصد سے سچی لگن اور کسی نصب العین سے مخلصانہ وابستگی کا صرف ایک ہی معیار ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ہم اُس کے حصول کے لیے کس قدر ایثار اور قربانی کر سکتے ہیں اور اپنے ذاتی آرام و آسائش کو اُس کے لیے کس حد تک تیاگ دینے کے لیے آمادہ ہیں۔ ایک شخص کے دل میں کسی مقصد کے ساتھ جتنا زیادہ عشق ہوگا اتنا ہی وہ اس کے لیے اپنا وقت، اپنی جان، اپنا مال، اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں، اپنی ذاتی خواہشات اور تمناؤں کو قربان کرنے کے لیے تیار ہوگا۔ اگر کوئی فرد یہ کہتا ہے کہ میں اپنی زندگی کا فلاں مقصد رکھتا ہوں لیکن اُس کے حصول کے لیے اپنے کسی مفاد کو نظر انداز کرنے کے لیے کمربستہ نہیں ہوتا، تو وہ اپنے عمل سے اپنے قول کی تردید کر دیتا ہے۔ نصب العین سے محبت واقعی ایک قلبی کیفیت کا نام ہے۔ لیکن یہ کیفیت کوئی ایسی چیز نہیں جو محض سینے کا ایک سربستہ راز ہو۔ بلکہ یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو عملی زندگی کی مہمات سے لیکر اُس کی معمولی سے معمولی جزئیات تک میں پوری طرح جھلکتا ہے۔ انسانی نفسیات نے کسی شخص کے قول کو جانچنے کے لیے ہمیں جو معیارات دیئے ہیں اُن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جتنا کوئی عمل غیر ارادی ہوگا اتنا ہی وہ اُس کی قلبی کیفیات کا بہتر شارح اور ترجمان ہوگا۔ چنانچہ اخبارات کی عام اور معمولی خبروں کو دیکھ کر اس امر کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہاں کا برسرِ اقتدار طبقہ اسلام اور اُس کی تعلیمات پر کتنا یقین رکھتا ہے۔ یہ آرٹ کونسلوں کی دل و جان سے سرپرستی، مخلوط تعلیم کی ہمت افزائی، رقص و سرود کے ذریعہ اپنے کلچر کی دوسرے ممالک میں نمائندگی، سودی کاروبار کا روز افزوں فروغ اور اس کے لیے نت نئے منصوبے اور اسلام کے اوامر و نواہی کی کھلے بندوں تضحیک، سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ قوم کو اسلام کے قریب لانے کے بجائے ایک بندھے ٹکے پروگرام کے تحت اس سے دور لے جایا جا رہا ہے اور اسلام کے حق میں مختلف مواقع پر مدح و ستائش کے کلمات محض تکلفات ہیں جن سے عوام کو

بیوقوف بنایا جا رہا ہے۔ جس نصب العین سے انحراف کے لیے ہم مسلسل تگ و دو کرتے رہیں، اس کا صرف وقتاً فوقتاً نام لینے سے تو اُسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی نسخہ اسی صورت میں کارگر ہوتا ہے جب اُسے پورے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ استعمال کیا جائے اور اُن تمام چیزوں سے پرہیز اور احتیاط کو عملاً ملحوظِ خاطر رکھا جائے جو اس کے موثر اور نتیجہ خیز ہونے میں مانع ہوں۔

یہ حقیقت گو بڑی تلخ ہے لیکن اس سے انکار بھی ممکن نہیں کہ ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات پر سے یقین اٹھتا چلا جا رہا ہے۔ دل و دماغ سے اس کی عظیم صداقت اور غیر معمولی عظمت کے نقوش آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔ ہم زبان سے بلاشبہ اقرار کرتے ہیں کہ یہ ہمارے سارے دکھوں کا مداوا اور ہمارے سارے مسائل کا واحد حل ہے، لیکن دل کی گہرائیوں سے اس عظیم حقیقت کو ـــــ اس حقیقت کو جس پر یہ پوری کائنات گواہ ہے ـــــ تسلیم نہیں کرتے۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم کسی شے کو اپنے حق میں تریاق بھی سمجھیں لیکن زہر کے مہلک اثرات سے بچنے کے لیے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں اور اس کی جگہ اُن نسخوں کو آزمائیں جنہوں نے ہماری زندگی کے ہر حصے کو زہر آلود کر کے اُسے بالکل مفلوج بنا رکھا ہے۔

اسلام کے معاملے میں ہمارے اس منافقانہ طرزِ عمل کو سمجھنے کے لیے مشاہدہ کی کوئی شدید ریاضت یا عقل کی کوئی غیر معمولی مقدار درکار نہیں۔ ہمارے ملک کے روزمرہ کے واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ شراب کے متعلق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام بالکل واضح ہیں۔ اس کی حرمت کے بارے میں امت کے کسی گروہ نے کسی وقت بھی اختلاف نہیں کیا۔ پھر یہ کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ بھی نہیں جو ہمارے حکام عالی مقام کی سمجھ میں نہ آتا ہو۔ اور شراب انسانی زندگی کی کوئی بنیادی ضرورت بھی نہیں جس کے بغیر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی گاڑی نہ چل سکتی ہو۔ مغربی اقوام جو اس کی بڑی رسیا ہیں وہ بھی اسے ضرر رساں تعیّش (HARMFUL LUXURY) کی

فہرست میں شامل کرتی ہیں۔ ایسی بیکار اور حرام شے کا، جو صحت اور اخلاق دونوں کے لیے تباہ کن ہے، پاکستان میں چلن ممکن نہ تھا اور اس امر کی بجا طور پر توقع تھی کہ اس ملک کے ارباب اختیار، جو اسلام سے محبت اور عقیدت کے دعویدار ہیں، اہل پاکستان کو اس لعنت سے نجات دلانے کی پوری کوشش کریں گے لیکن صوبائی اور قومی اسمبلی کی کارروائیوں کی جو روداد یں ابھی حال ہی میں اخبارات میں شائع ہوئی ہیں اُن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس حرام شے کے استعمال میں چند سالوں میں غیر معمولی اضافہ ہُوا ہے۔

وزیر صنعت مسٹر الطاف حسین کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق گزشتہ پانچ سے سات سال کی مدت میں شراب کی تیاری اور استعمال میں کم و بیش دگنا اضافہ ہو گیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں یعنی مارشل لا کے نفاذ کے وقت پاکستان میں کل ۶۵ ہزار ۰ ۳۹ گیلن دیسی شراب تیار ہوتی تھی۔ ۱۹۶۴ء تک یہ مقدار بڑھ کر ایک لاکھ ۴۳ ہزار ۷ ۳۵ گیلن ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء میں ولایتی قسم کی جو شراب پاکستان میں تیار ہوتی تھی اس کی مقدار ا ۵ ہزار ۲۲ ۸ گیلن تھی۔ ۱۹۶۴ء میں یہ بڑھ کر ۸۰ ہزار ۹ ۳۷ گیلن تک پہنچ گئی۔ وزیر صنعت نے اسی ضمن میں یہ بھی بتایا کہ ۱۹۵۸ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک ۶ سال کے اندر اس ملک میں ۳۶ لاکھ گیلن سے زائد شراب تیار کی گئی ہے جس میں ۲۴ لاکھ گیلن سے زائد بیئر بھی شامل ہے۔ انہوں نے اس امر کا انکشاف بھی کیا کہ ۱۹۶۰-۶۱ء سے لے کر ۱۹۶۴-۶۵ء تک پانچ سال کے اندر اس خطۂ پاک میں ۴۳ لاکھ گیلن سے زائد شراب استعمال کی گئی ہے جس میں سے مشرقی پاکستان میں صرف پانچ لاکھ ۴۲ ہزار ا ۳۵ گیلن شراب استعمال ہوئی۔ اسی سلسلے میں انہوں نے اہلِ پاکستان کو اس بات سے بھی مطلع فرمایا ہے کہ مغربی پاکستان نہ صرف اس اُمّ خبائث کے استعمال میں مشرقی پاکستان پر سبقت لے گیا ہے بلکہ اس ام الخبائث کے تیار کرنے میں بھی وہ مشرقی بازو کی نسبت غیر معمولی فوقیت رکھتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں شراب بنانے کا صرف ایک کارخانہ ہے اور مغربی پاکستان میں ان کارخانوں کی تعداد چار ہے۔

پھر ذرا اس بات کو بھی نگاہ میں رکھیے کہ ملک و قوم کی بھلائی چاہنے والے وہ اربابِ اختیار جو پاکستان کے معاشی استحکام کے لیے اتنے فکر مند ہیں کہ انہوں نے زرِ مبادلہ کی بچت کے لیے حج جیسے اہم دینی فریضہ پر پابندی لگا رکھی ہے، اس حرام شئے کی درآمد کے معاملے میں ان کو زرِ مبادلہ بچانے کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ۲۶ جون کو مرکزی حکومت کے پارلیمانی سیکرٹری جناب نور الحق چودھری نے غیر ملکی شراب کی درآمد کا جو گوشوارہ قومی اسمبلی میں پیش کیا ہے اُسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۶۰ء میں اس مد پر ۱۰ لاکھ ۲۹ ہزار کا زرِ مبادلہ صرف ہوا تھا اور اس کے بعد اس میں بڑی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں یہ مقدار ۳۱ لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔ ۱۹۶۲ء میں یہ ۳۳ لاکھ ۷۷ ہزار ہو گئی۔ ۱۹۶۳ء میں یہ اور بڑھی اور ۴۰ لاکھ ۸۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ ۱۹۶۴ء میں اس کے اندر مزید اضافہ ہوا اور یہ بڑھ کر ۵۴ لاکھ ۹۷ ہزار تک جا پہنچی۔ اس طرح صرف پانچ سالوں میں جبکہ پورے ملک میں صرف ایک شخص کو بلا شرکتِ غیر حکمرانی کے تمام اختیارات حاصل تھے اور جو یہاں کے سیاہ و سپید کا پوری طرح مالک تھا، اس خطۂ ارضی میں اس حرام شئے کی درآمد پر ایک کروڑ ۷۱ لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ کا زرِ مبادلہ صرف کر ڈالا گیا۔ جس رفتار سے ہر سال اس رقم میں اضافہ ہوتا رہا ہے اُسے سامنے رکھا جائے تو بعید نہیں کہ اس مالی سال میں کم از کم ستر پچھتر لاکھ روپے کا زرِ مبادلہ اس مد پر صرف ہوا ہو۔ اس رقم کو بھی اگر شامل کر لیا جائے تو صرف پچھلے پانچ سالوں میں یعنی ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک غیر ملکی شراب کی صرف درآمد پر ڈھائی کروڑ روپیہ کا زرِ مبادلہ برباد ہوا ہے۔ معاشی اعتبار سے یہ کتنا عظیم نقصان ہے اس کا اندازہ مرکزی وزیرِ تجارت جناب غلام فاروق صاحب کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے چار کروڑ کی رقم سے پٹ سن کا ایک اتنا وسیع کارخانہ قائم کیا جا سکتا ہے جس سے کم از کم بیس ہزار افراد کو براہِ راست یا بالواسطہ روزگار مہیا ہو سکتا ہے۔

اس تصویر کا ایک دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ صوبائی وزیرِ آبکاری کے دیئے ہوئے اعداد و شمار

کی رُو سے مغربی پاکستان میں اِس وقت ۴۶۲۳ دوکاندار شراب فروشی کے باقاعدہ لائسنس یافتہ ہیں اور ان میں سے پورے ۲۵۷ مسلمان ہیں۔ افیون فروشی کے لائسنس یافتہ دوکانداروں میں مسلمانوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں مسلمان ۳۰۲ ہیں اور غیر مسلم صرف ۱۴۔ کیا مسلم اکثریت کے علاقوں کو پاکستان بنانے کا مطالبہ اسی لیے کیا گیا تھا کہ ہم اِن گناہوں میں اپنی اکثریت کی شان دکھائیں؟

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مغربی پاکستان میں سرکاری اعداد و شمار کی رُو سے اُن لوگوں کی تعداد ۵۳۷۶ ہے جن کو شراب نوشی کے باقاعدہ پرمٹ ملے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اس سوال کو جانے دیجیے کہ مسلمانوں کو شراب نوشی کے پرمٹ دینا ایک مسلمان ملک کی حکومت کو کہاں تک زیبا ہے۔ ہم صرف یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ۴۶۲۳ شراب فروشوں کا کاروبار صرف ۵۳۷۶ گاہکوں کے بل پر چل سکتا ہے؟ حساب سے تو فی دوکاندار پُورے ۱۲ گاہک بھی نہیں پڑتے۔ لامحالہ پرمٹ کے بغیر شراب پینے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، ورنہ اتنے شراب فروش اپنی تجارت ہرگز نہیں چلا سکتے۔

مرکزی اور صوبائی اسمبلی میں اس موضوع پر اربابِ حکومت نے جو تقریریں کی ہیں وہ ذہنی انتشار کی بڑے کھلے طور پر غمازی کرتی ہیں۔ اُن کے پڑھنے سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اصحابِ اقتدار اس خبیث شے سے اتنے ہی متنفر اور بیزار ہیں جتنا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے اور وہ اسے ختم کرنے کے دل و جان سے آرزومند ہیں، مگر بے چارے محض غیر ملکی ماہرین کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اسے گوارا کر رہے ہیں۔ انہیں خدشہ لاحق ہے کہ اگر انہوں نے اس پر پوری طرح پابندی عائد کر دی تو یہ غیر ملکی لوگ ناراض ہو کر فوراً ملک سے بھاگ جائیں گے اور اس طرح ہماری تعمیر و ترقی کے مختلف منصوبوں کی تکمیل مشکل ہو جائے گی اور ان کے جانے سے ملکی ساکھ اور اس کی معیشت کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ ہم اس اندازِ فکر کو بنیادی طور پر اسلام کے

منافی سمجھتے ہیں۔ ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم صرف خالق کی خوشنودی کا خیال رکھو اور اُس کی خوشنودی پر کسی دوسرے کی خوشنودی کو ترجیح نہ دو۔ لیکن ہمارے وزراء کرام اسمبلی کے اندر معزز ارکان کے سامنے اس بات کا برملا اعتراف کر رہے ہیں کہ اُن کے نزدیک غیر ملکی ماہرینِ فن کی ناراضی خداوند تعالیٰ کی ناراضی سے کہیں زیادہ اہم ہے اور خدا خواہ ناراض ہو جائے لیکن وہ "ان جھوٹے خداؤں" کی ناراضی مول لینے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان کے اس طرزِ استدلال کی حقائق اور واقعات پوری طرح تکذیب کرتے ہیں۔ اگر وہ فی الحقیقت اس خبیث شے کو محض غیر ملکی ماہرین کی وجہ سے انتہائی مجبوری کے عالم میں برداشت کر رہے ہیں تو پھر ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر پاکستان کے مسلم باشندوں کو اس کی خرید و فروخت کی اجازت کیوں دی جاتی ہے۔ اس حرام چیز کے استعمال اور اس کے کاروبار سے حتی الوسع مسلم آبادی کو تو پوری طرح بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ لیکن یہاں عملاً ہو کیا رہا ہے۔ حکومت مسلمانوں کو خود شراب نوشی کے پرمٹ اور اس کی فروخت کے لیے لائسنس عطا کرتی ہے جیسا کہ اسی کے دیئے ہوئے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کیا حکومت کی طرف سے عطا کردہ یہ اجازت نامے اور لائسنس اس بات کی کھلی دلیل نہیں ہیں کہ یہاں یہ اخلاق سوز کاروبار عین حکومت کی سرپرستی میں ہو رہا ہے اور وہ مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھنے کی بجائے انہیں اس سے بہرہ مند کرنے پر مصر ہے۔

تیسرے پانچسالہ منصوبے کی جو تفصیلات سامنے آئی ہیں اُن کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری حکومت اضافہ آبادی کو ایک خطرناک روگ سمجھ کر اس کے تدارک کے لیے سب سے زیادہ فکرمند ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے اس نے ۳۰ کروڑ روپے کی رقم مختص کی ہے اور ساٹھ ہزار کارکنوں کی فوج ظفر موج کو میدانِ عمل میں اتارنے کا پروگرام بنایا ہے۔ معلوم نہیں کس شیطان نے ہمارے ملک کے ارباب بست و کشاد کے کانوں میں یہ بات پھونک دی ہے کہ

کثرتِ آبادی ہر لحاظ سے کسی ملک کے لیے ایک تشویشناک علامت ہے اور اس کے روکنے سے اُس کے سارے معاشی اور معاشرتی مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

ضبطِ تولید کوئی معاشی مسئلہ نہیں بلکہ یہ انسان کے جذبۂ ایثار، اس کے احساسِ عصمت و عفّت اور اُس کی عزتِ نفس کے خلاف ایسی خوفناک سازش ہے جس نے انسانی عزو شرف کی ساری اقدار کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جب بھی کسی قوم کے اندر خود غرضی، مادّی فوائد و لذائذ کی پرستش اور اخلاقی ذمہ داریوں سے بغاوت کے منفی رجحانات نے زور پکڑا، ان کے نتیجے میں ضبطِ تولید کی تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ جس قوم نے بھی اس تحریک کو اپنایا اُسے قدرت نے دنیا سے حرفِ غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔ یہ سراسر ایک منفی تحریک ہے جس میں تعمیر کا کوئی پہلو مضمر نہیں، یہ انسان کے احساسِ شکست کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

آبادی کی کثرت کوئی خطرناک بیماری نہیں بلکہ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جسے قبول کرنے کی وجہ سے قوموں کے اندر حرکت اور حرارت پیدا ہوتی ہے، اُن کے اندر زندہ رہنے، آگے بڑھنے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا ولولہ بیدار ہوتا ہے تاریخ کے اوراق میں قوموں کے عروج و زوال کی جو مختلف داستانیں بکھری پڑی ہیں اُن کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ آبادی کی کثرت نے بسا اوقات بڑی بڑی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ مشہور مؤرخین، ابن خلدون، گبن اور ارنلڈ ٹائن بی نے یونان و روم کے زوال پر جو فاضلانہ بحثیں کی ہیں وہ اس بات کی پوری طرح تائید کرتی ہیں کہ جب کسی قوم نے آبادی کو روکنے کی کوشش کی تو اُس کی صلاحیتیں مضمحل ہو کر رہ گئیں۔ ان دونوں قوموں نے جو غیر معمولی ترقی کی۔ اور اپنی معاصر اقوام پر اپنی برتری کا جو نقش بٹھایا وہ کسی لکھے پڑھے شخص سے پوشیدہ نہیں۔ آغاز میں آبادی کے اضافے نے ان اقوام کے اہلِ بصیرت کو دعوتِ فکر و عمل دی اور انہوں نے اس مسئلہ کو کامیابی سے حل کرنے کے لیے ایک ایسے نظامِ سیاست، نظامِ معیشت اور نظامِ

معاشرت کی تشکیل کی جو تعمیری نقطۂ نظر سے اپنے دور کے رائج الوقت نظاموں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے بہتر تھا لیکن مال و دولت کی فراوانی اور دنیاوی عیش و آرام کی غیر معمولی دلچسپی نے انہیں ایک طرف نہ صرف خدا سے یکسر مایوس اور غافل بنا دیا بلکہ ان کے بیمار ذہنوں نے ایسے دیوتاؤں کو اختراع کیا جن سے ان کے جذبۂ بے بسی اور بے چارگی کی تسکین ہوتی ہو اور جو ان کے ذہنی اضمحلال کی پوری طرح نمائندگی کرتے ہوں۔ چنانچہ یونانی مذہب ایک طلسم ہوشربا ہے جس میں تخلیق کا کوئی پہلو نہیں۔ اس کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ یونان کے نزدیک "آسمانی خدا" اہلِ زمین کے معاملے سے بالکل بے تعلق ہو چکے تھے۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑے بے رحم تھے اور فطرت کے ہاتھوں اسی طرح بے بس تھے جس طرح انسان بے بس ہوتے ہیں۔ کارِ دنیا سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ انسانی مصائب و آلام کو دیکھ کر خندہ زن ہوتے اور انسانی محرومیوں کی داستانیں سن کر لطف اٹھاتے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے معاملات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگئے جو ہر قسم کے اخلاقی احساس سے بیگانہ تھے اور انہوں نے یونان کے معاشی اور معاشرتی نظام کو خالص مفاد پرستی کی بنیاد پر استوار کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ملک کی زمامِ کار ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں آگئی جس نے اپنے ناجائز مفادات کی حفاظت کے لیے عوام کے اندر اس باطل خیال کی آبیاری شروع کی کہ حکومت کرنے کا حق ایک مخصوص گروہ کو ہے جو ذہنی اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتا ہے۔ معاشرہ بڑے ہولناک نتائج سے دوچار تھا لیکن یہ برسرِ اقتدار طبقہ ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے اپنے معیارِ زندگی کو بڑھانے اور ذہنی عیاشیوں میں منہمک تھا۔ اس طبقہ نے اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے اور اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ضبطِ تولید کا پرچار شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی بڑی تیزی کے ساتھ گھٹنے لگی اور ارد گرد کی جفاکش قوموں نے انہیں نیست و نابود کر کے رکھ دیا۔

یونان و روم کی طرح مغرب بھی اب ایک [illegible] پر پہنچ گیا ہے جہاں سے وہ [illegible] عملاً منتقل

ظاہر ہو رہی ہیں جو کسی تہذیب کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہوتی ہیں۔ ابتداءً میں آبادی کے دباؤ نے اہلِ مغرب کو پیدائشِ دولت کے نئے نئے طریقے دریافت کرنے پر مجبور کیا اور انہوں نے صنعتی ایجادات میں حیرت انگیز ترقی کر کے آبادی کے اس چیلنج کو بڑی کامیابی کے ساتھ قبول کیا۔ اسی کی بدولت اہلِ یورپ دیکھتے دیکھتے پوری دنیا پر چھا گئے۔ مگر بدقسمتی سے وہ اپنی دنیاوی قوت و طاقت اور اخلاق کے مابین توازن قائم نہ کر سکے اور مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی ہوس نے انہیں اخلاقی اور روحانی اقدار سے یکسر غافل کر کے خالصتہً دنیا پرست بنا دیا۔ اس باطل طرزِ فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی ترقی یک رُخی ہو گئی اور انہوں نے مادّی فوائد و لذائذ کے حصول کو ہی اپنا مقصود و مطلوب قرار دیا۔ اِس سے اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو شدید نقصان پہنچا اور اُن کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ مالک الملک کے عطا کردہ رزق کے اتھاہ خزانوں اور خداداد فکر و عمل کی خداداد قوتوں پر انہیں کوئی اعتقاد باقی نہ رہا۔ انہوں نے اسی مادّی زندگی کو منتہائے مقصود سمجھ کر جب غور کرنا شروع کیا تو مستقبل انتہائی تاریک نظر آیا۔ اخلاقی اصول و ضوابط سے تغافل نے اُن کے لیے زندگی کی عجیب و غریب پیچیدگیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ چنانچہ مادّی لذت ہی میں انہوں نے سکون تلاش کرنے کی کوشش کی اور ہر اُس اقدام کی مخالفت کی جس سے اس میں کسی کمی کا خطرہ نظر آتا ہو۔ اس کا پہلا ہدف اولادِ بنی آدم اور انہوں نے ایک باطل فلسفے کے ذریعہ دنیا کی اس بزم میں نئے شرکاء کا راستہ روکنے کی پوری جد و جہد کی۔

جس مادّی نظریۂ حیات پر انہوں نے اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کر رکھی ہے اس کے لیے ضبطِ تولید بڑا مفید اور کارآمد نسخہ ہے۔ اس سے انسان معاشرتی ذمہ داریوں سے یکسر آزاد ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ دنیاوی لذات سے متمتع ہو سکتا ہے۔ زنا [illegible] نے جو قدغن لگا رکھی ہے خاندانی منصوبہ بندی سے وہ ختم ہو جاتی ہے اور انسان پو[illegible] کے ساتھ دادِ عیش دے سکتا ہے۔

ابنِ خلدون نے قوموں کے زوال کا جو تجزیہ کیا ہے اُس کے مطابق اگر مغربی ممالک کا جائزہ لیا جائے تو اُن کی بربادی کے سارے آثار سامنے آجاتے ہیں۔ انگلستان اس وقت جس صورتِ حال سے دوچار ہے وہ تہذیبی نقطۂ نظر سے انتہائی سنگین ہے۔ انگریز قوم جو کبھی بڑی محنتی اور جفاکش خیال کی جاتی تھی وہ اب انتہائی عیش پرست بن گئی ہے اور اہلِ یونان کے غلاموں کی طرح اُن کے سارے کاروبار کو مشرق سے آئے ہوئے محنت کش چلا رہے ہیں جس قوم کی معیشت کا پورا دار و مدار دوسری قوموں پر ہو وہ آخر اسے ایک لمبی مدت تک کس طرح سنبھال سکتی ہے۔ قریب قریب یہی حال یورپ کی دوسری قوموں کا بھی ہے۔ وہ سب اپنی دولت و ثروت کے باوجود اپنی معاشی زندگی کے استحکام کے لیے مشرقی مزدوروں کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ چونکہ اضافہ آبادی اُن کے لیے اب کوئی مسئلہ نہیں رہا، اس لیے اُن کی جدوجہد دن بدن کمزور پڑتی جارہی ہے اور اُن کے اندر تعمیر و ترقی کا وہ ولولہ ختم ہوتا نظر آتا ہے جس سے انہوں نے اپنی تہذیب کا آغاز کیا تھا۔ ضبطِ تولید کی تحریک جب ایک مرتبہ عوام میں مقبول ہو جائے تو پھر آبادی کے انحطاط کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ انفرادی زندگی کی آسائشیں انسان کو قومی ضروریات سے بالکل غافل بنا دیتی ہیں اور پھر انسان کبھی اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ وہ اجتماعی مصالح کی خاطر کسی بڑے خاندان کا بوجھ اٹھانے کی ہمت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یونان اور روم کی طرح اہلِ یورپ بھی تعیشات کی فراہمی میں غیر معمولی ہنرمندی کا مظاہرہ کریں گے لیکن تعداد کے اعتبار سے کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے نظام کے قیام کے لیے مشرقی قوموں کے محتاج ہوں گے۔ اس وقت تو ان اقوام کے محنت کشوں کی حیثیت کوئی زیادہ اہم نظر نہیں آتی اور یُوں محسوس ہوتا ہے کہ مغربی اقوام ان سے جس وقت چاہیں بے نیاز ہو سکتی ہیں۔ مگر ان کے اندر جس سرعت کے ساتھ کاہلی اور سُستی پیدا ہو رہی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرق سے آئے ہوئے مزدور، کمزور ہونے کے باوجود مغربی صنعتوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل کرلیں گے اور اس طرح اُن کا نظامِ معیشت اور معاشرت مزید کمزور ہو جائے گا۔

یونان، روم اور یورپ میں ضبطِ تولید کی تحریک ایک باطل طرزِ فکر اور مادہ پرستانہ فلسفۂ حیات کی وجہ سے شروع ہوئی اور یہ اُس ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر کافی حد تک مقبول بھی ہو گئی۔ اس نے اہلِ مغرب کو اس بات کا موقع فراہم کیا کہ وہ سمٹ سمٹا کر کچھ دیر اور زندہ رہنے کا انتظام کر سکیں۔ لیکن ہمیں اُس بدنصیب قوم کے اندازِ فکر پر سخت حیرت ہوتی ہے جو اللہ اور اُس کی رحمتوں پر یقین رکھتی ہے، جس کے نزدیک اخلاق، عفت اور پاکدامنی حیاتِ انسانی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے، جو دنیاوی لذتیں سمیٹنے کے لیے زندہ نہیں بلکہ آخرت میں فلاح و کامرانی کے حصول کے لیے اس دنیا میں جدوجہد کرتی ہے۔ جسے قدم قدم پر ایثار کا درس دیا گیا ہے۔ جسے بنیادی طور پر یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ رزق کی ساری کنجیاں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور انسان کو ایک مقرر پیمانے کے مطابق وسائلِ رزق فراہم کیے جاتے ہیں، جس نے آج سے چودہ سو برس پیشتر اضافہ آبادی کے چیلنج کو حیرت انگیز کامیابی سے قبول کیا اور اُس وقت کے انسانوں کو جو بھوک و افلاس کے خوف سے قتلِ اولاد کے مرتکب ہوتے تھے بڑی صراحت اور تاکید کے ساتھ کہا "ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں، اور انہیں بھی (جنہیں تم بھوک کی وجہ سے قتل کرنے کے درپے ہو)۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ضبطِ تولید کی تحریک کسی معاشی مسئلہ کے حل کی کوئی مؤثر تدبیر نہیں، بالکل ایک باطل نظامِ فکر کی ایک کڑی ہے۔ اِس تحریک سے الحاد اور کفر کو تقویت پہنچتی ہے، اس سے خاندانی نظام کی جڑیں متزلزل ہوتی ہیں اور معاشرتی زندگی ایثار و تعاون کے جذبہ پر استوار ہونے کے بجائے خود غرضی کی شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تحریک اخلاقی اقدار کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے اگر ایک طرف چند لوگوں کا معیارِ زندگی بڑھتا ہے تو دوسری طرف پوری قوم کی تخلیقی قوتیں مضمحل ہوتی ہیں اور جلد ہی وہ نقطۂ انحراف آجاتا ہے جہاں اقوام آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی بجائے کارگہِ حیات میں مسلسل پسپا ہونے لگتی ہیں اور سمٹتے سمٹتے اس حد تک کمزور پڑ جاتی ہیں کہ اُن کے لیے اپنے آپ کو زندہ رکھنا بھی ممکن نہیں رہتا۔ جس قوم کے افراد وقت کے چیلنج کو قبول

کرنے اور اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو اٹھانے سے اعراض کریں ان کے بقا کا آخر دنیا کی کونسی قوت انتظام کر سکتی ہے۔

ہمیں اُن لوگوں کی عقل پر ماتم کرنا چاہیے جو ان سب حقائق سے آنکھیں بند کر کے پاکستان میں ضبطِ تولید کی تحریک کو کامیاب بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ کیا اُن سے یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ آج بھی قوموں کے لیے عددی قوت غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ پاکستان چاروں طرف سے ایسے دشمنوں سے گھرا ہوا ہے جو تعداد کے اعتبار سے اس سے کئی گنا زیادہ ہیں اور جو کسی وقت بھی اس کے لیے عظیم خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔

اس ملک میں آبادی کا اضافہ کوئی خدشہ نہیں بلکہ ملکی استحکام کا ذریعہ بن سکتا ہے بشرطیکہ قدرت کی اس نعمت سے صحیح طور پر فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ ایک چیلنج ہے جسے اگر مردانگی سے قبول کیا جائے تو اس سے ایک صحت مند نظامِ حیات معرضِ وجود میں آسکتا ہے جو ایثار و تعاون اور معاشرتی انصاف کی بنیادوں پر استوار ہو۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسا تعمیری اور صبر آزما کام ہے جو قوم اور اس کے اربابِ اختیار سے قربانی کا طالب ہے، اس لیے اس کے مقابلے میں تعمیری طرزِ فکر اختیار کرنے کے بجائے اُس طرزِ عمل کا پرچار کیا جا رہا ہے جو بربادی کی طرف لے جانے والا ہے، جسے دنیا کی قوموں نے اس وقت اختیار کیا جب اُن کی ساری تخلیقی قوتیں ختم ہو گئیں۔ اس ملک میں یہ تحریک ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے مال و جان کا زبردست زیاں کرنا ہو گا اور یہاں یہ اسی وقت کامیاب ہو سکے گی جب یہاں کی عظیم اکثریت خدا اور اس کے رسول سے مُنہ موڑ لے۔

وہ لوگ جو اس ملک میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کا عزم رکھتے ہیں اُن کے افکار و نظریات کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ وہ اس تحریک کے (باقی صفحہ ۲ پر)

تفہیم القرآن

الجاثیہ

نام آیت ۲۸ کے فقرہ وَتَرٰی کُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورۃ جس میں لفظ جاثیہ آیا ہے۔

زمانۂ نزول اس سورۃ کا زمانۂ نزول بھی کسی معتبر روایت میں بیان نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کے مضامین سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورۂ دخان کے بعد قریبی زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین میں ایسی مشابہت ہے جس سے یہ دونوں توام نظر آتی ہیں۔

موضوع اور مباحث اس کا موضوع توحید و آخرت کے متعلق کفارِ مکہ کے شبہات و اعتراضات کا جواب دینا، اور اُس رویّے پر اُن کو متنبہ کرنا ہے جو اُنہوں نے قرآن کی دعوت کے مقابلے میں اختیار کر رکھا تھا۔

کلام کا آغاز توحید کے دلائل سے کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں انسان کے اپنے وجود سے لے کر زمین و آسمان تک ہر طرف پھیلی ہوئی بے شمار نشانیوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا ہے کہ تم جدھر بھی نگاہ اٹھا کر دیکھو، ہر چیز اُسی توحید کی شہادت دے رہی ہے جسے ماننے سے تم انکار کر رہے ہو۔ یہ طرح طرح کے حیوانات، یہ شب و روز، یہ بارشیں اور ان سے اُگنے والی نباتات، یہ ہوائیں، اور یہ انسان کی اپنی پیدائش، اِن ساری چیزوں کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر دیکھے اور کسی تعصب کے بغیر اپنی عقل کو

سیدھے طریقے سے استعمال کرکے اِن پر غور کرے تو یہ نشانیاں اسے اس امر کا یقین دلانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ کائنات بے خدا نہیں ہے، نہ بہت سے خداؤں کی خدائی میں چل رہی ہے، بلکہ ایک ہی خدا نے اسے بنایا ہے، اور وہی اکیلا اس کا مدبّر اور فرمانروا ہے۔ البتہ اُس شخص کی بات دوسری ہے جو نہ ماننے کی قسم کھا کر بیٹھ گیا ہو، یا شکوک و شبہات ہی میں پڑے رہنے کا فیصلہ کرچکا ہو۔ اُسے دنیا میں کہیں سے بھی یقین و ایمان کی دولت حاصل نہیں ہوسکتی۔

آگے چل کر دوسرے رکوع کی ابتدا میں پھر فرمایا گیا ہے کہ انسان اِس دنیا میں جتنی چیزوں سے کام لے رہا ہے، اور جو بے حد و حساب اشیاء اور قوتیں اس کائنات میں اُس کے مفاد کی خدمت کر رہی ہیں، وہ آپ سے آپ کہیں سے نہیں آگئی ہیں، نہ دیویوں اور دیوتاؤں نے انہیں فراہم کیا ہے، بلکہ وہ ایک ہی خدا ہے جس نے یہ سب کچھ اپنے پاس سے اُس کو بخشا اور اُس کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ کوئی شخص صحیح غور و فکر سے کام لے تو اس کی اپنی عقل ہی پکار اُٹھے گی کہ وہی خدا انسان کا محسن ہے اور اُسی کا یہ حق ہے کہ انسان اُس کا شکر گزار ہو۔

اس کے بعد کفارِ مکہ کو اُس ہٹ دھرمی، اِستکبار، استہزاء اور اصرار علی الکفر پر سخت ملامت کی گئی ہے جس سے وہ قرآن کی دعوت کا مقابلہ کر رہے تھے، اور انہیں خبردار کیا گیا ہے کہ یہ قرآن وہی نعمت لے کر آیا ہے جو پہلے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی، جس کی بدولت وہ تمام اقوامِ عالم پر فضیلت کے مستحق ہوئے تھے! انہوں نے جب اِس نعمت کی ناقدری کی اور دین میں اختلاف کرکے اسے کھو دیا، تو اب یہ دولت تمہارے ہاں بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا ہدایت نامہ ہے جو دین کی صاف شاہراہ انسان کو دکھاتا ہے۔ جو لوگ اپنی جہالت و حماقت سے اس کو رد کرینگے وہ اپنی ہی تباہی کا سامان کرینگے۔ اور خدا کی تائید و رحمت کے مستحق صرف وہ لوگ

ہوں گے جو اِن کی پیروی قبول کر کے تقویٰ کی روش پر قائم ہو جائیں۔

اِسی سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو ہدایت کی گئی ہے کہ یہ خدا سے بے خوف لوگ تمہارے ساتھ جو بیہودگیاں کر رہے ہیں اُن پر درگزر اور تحمل سے کام لو۔ تم صبر کرو گے تو خدا خود اِن سے نمٹے گا اور تمہیں اس صبر کا اجر عطا فرمائے گا۔

پھر عقیدۂ آخرت کے متعلق کفار کے جاہلانہ خیالات پر کلام کیا گیا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ زندگی بس اِسی دنیا کی زندگی ہے، اِس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ ہم گردشِ ایام سے بس اُسی طرح مرتے ہیں جس طرح ایک گھڑی چلتے چلتے رُک جائے۔ موت کے بعد کوئی روح باقی نہیں رہتی جسے قبض کیا جاتا ہو اور پھر کسی وقت دوبارہ لا کر انسانی جسم میں پھونک دیا جاتے۔ اس چیز کا اگر تمہیں دعویٰ ہے تو ہمارے مرے ہوئے آبا و اجداد کو زندہ کر کے دکھاؤ۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پے درپے چند دلائل ارشاد فرمائے ہیں:

ایک یہ کہ تم یہ بات کسی علم کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہو بلکہ محض گمان کی بنیاد پر اتنا بڑا حکم لگا بیٹھے ہو۔ کیا فی الواقع تمہیں یہ علم ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے اور روحیں قبض نہیں کی جاتیں بلکہ فنا ہو جاتی ہیں؟

دوسرے یہ کہ تمہارے اس دعوے کی بنیاد زیادہ سے زیادہ بس یہ ہے کہ تم نے کسی مرنے والے کو اٹھ کر دنیا میں آتے نہیں دیکھا ہے۔ کیا یہ بات اتنا بڑا دعویٰ کر دینے کے لیے کافی ہے کہ مرنے والے پھر کبھی نہیں اٹھیں گے؟ کیا تمہارے تجربے اور مشاہدے میں کسی چیز کا نہ آنا یہ معنی رکھتا ہے کہ تمہیں اُس چیز کے نہ ہونے کا علم حاصل ہے؟

تیسرے یہ کہ یہ بات سراسر عقل اور انصاف کے خلاف ہے کہ نیک اور

بد، فرمانبردار اور نافرمان، ظالم اور مظلوم، آخر کار سب یکساں کر دیئے جائیں، کسی بھلائی کا کوئی اچھا نتیجہ اور کسی برائی کا کوئی برا نتیجہ نہ نکلے، نہ کسی مظلوم کی دادرسی ہو اور نہ کوئی ظالم اپنے کیے کی سزا پائے، بلکہ سب ایک ہی انجام سے دوچار ہوں۔ خدا کی اس کائنات کے متعلق جس نے یہ تصوّر قائم کیا ہے اُس نے بڑا ہی غلط تصوّر قائم کیا ہے۔ اِس تصوّر کو ظالم اور بدکار لوگ تو اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے افعال کا برا نتیجہ نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن خدا کی یہ خدائی اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ یہ ایک برحق نظام ہے جس میں نیک و بد کو بالآخر یکساں کر دینے کا ظلم ہرگز نہیں ہو سکتا۔

چوتھے یہ کہ انکارِ آخرت کا عقیدہ اخلاق کے لیے سخت تباہ کُن ہے۔ اس کو اختیار وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے نفس کے بندے بنے ہوتے ہیں، اور اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں بندگیٔ نفس کی کھلی چھوٹ مل جائے۔ پھر جب وہ اس عقیدے کو اختیار کر لیتے ہیں تو یہ انہیں گمراہ سے گمراہ تر کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اُن کی اخلاقی حس بالکل مُردہ ہو جاتی ہے اور ہدایت کے تمام دروازے اُن کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔

یہ دلائل دینے کے بعد اللہ تعالیٰ پورے زور کے ساتھ فرماتا ہے کہ جس طرح تم آپ سے آپ زندہ نہیں ہو گئے ہو، بلکہ ہمارے زندہ کرنے سے زندہ ہوئے ہو، اسی طرح تم آپ سے آپ نہیں مر جاتے، بلکہ ہمارے موت دینے سے مرتے ہو، اور ایک وقت یقیناً ایسا آنا ہے جب تم سب بیک وقت جمع کیے جاؤ گے۔ اس بات کو اگر آج تم اپنی جہالت و نادانی سے نہیں مانتے تو نہ مانو، جب وہ وقت آ جائے گا تو تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے کہ اپنے خدا کے حضور پیش ہو اور تمہارا پورا نامۂ اعمال بے کم و کاست

تیار ہے جو تمہارے ایک ایک کرتوت کی شہادت دے رہا ہے۔ اس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا کہ عقیدۂ آخرت کا یہ انکار اور اس کا یہ مذاق جو تم اڑا رہے ہو تمہیں کس قدر مہنگا پڑا ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

حٰمٓ۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے[1]۔
حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں بے شمار نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے[2]

---

[1] یہ اس سورے کی مختصر تمہید ہے جس میں سامعین کو دو باتوں سے خبردار کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر نازل ہو رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے وہ خدا نازل کر رہا ہے جو زبردست بھی ہے اور حکیم بھی۔ اس کا زبردست ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان اس کے فرمان سے سرتابی کی جرأت نہ کرے، کیونکہ نافرمانی کر کے وہ اس کی سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اور اس کا حکیم ہونا اس کا متقاضی ہے کہ انسان پورے اطمینان کے ساتھ برضا و رغبت اس کی ہدایات اور اس کے احکام کی پیروی کرے، کیونکہ اس کی کسی تعلیم کے غلط یا نامناسب یا نقصان دہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

[2] تمہید کے بعد اصل تقریر کا آغاز اس طرح کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پس منظر میں اہل مکہ کے وہ اعتراضات ہیں جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ تعلیم پر کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آخر محض ایک شخص کے کہنے سے ہم اتنی بڑی بات کیسے مان لیں کہ جن بزرگ ہستیوں کے آستانوں سے آج تک ہماری عقیدتیں وابستہ رہی ہیں وہ سب ہیچ ہیں اور خدائی بس ایک خدا کی ہے۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ جس حقیقت کو ماننے کی دعوت تمہیں دی جا رہی ہے اس کی سچائی کے نشانات سے تو سارا عالم بھرا پڑا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ تمہارے اندر اور تمہارے باہر ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو شہادت دے رہی ہیں کہ یہ ساری کائنات ایک خدا اور ایک ہی خدا کی تخلیق ہے اور وہی اکیلا اس کا مالک حاکم اور

اور تمہاری اپنی پیدائش میں، اور اُن حیوانات میں جن کو اللہ (زمین میں) پھیلا رہا ہے، بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین لانے والے ہیں[۳]۔ اور شب و روز کے فرق و اختلاف میں[۴]، اور اُس رزق

مدبر ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ آسمان و زمین میں نشانیاں کس چیز کی ہیں۔ اس لیے کہ سارا جھگڑا ہی اُس وقت اس بات پر چل رہا تھا کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے خداؤں اور معبودوں کو بھی ماننے پر اصرار کر رہے تھے، اور قرآن کی دعوت یہ تھی کہ ایک خدا کے سوا نہ کوئی خدا ہے نہ معبود۔ لہٰذا ایسے میں یہ بات آپ ہی آپ موقع و محل سے ظاہر ہو رہی تھی کہ نشانیوں سے مراد توحید کی صداقت اور شرک کے بطلان کی نشانیاں ہیں۔

پھر یہ جو فرمایا کہ "یہ نشانیاں ایمان لانے والوں کے لیے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بجائے خود تو یہ نشانیاں سارے ہی انسانوں کے لیے ہیں، لیکن انہیں دیکھ کر صحیح نتیجے پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو ایمان لانے کے لیے تیار ہوں۔ غفلت میں پڑے ہوئے لوگ، جو جانوروں کی طرح جیتے ہیں، اور ہٹ دھرم لوگ، جو نہ ماننے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں، ان کے لیے اِن نشانیوں کا ہونا اور نہ ہونا یکساں ہے۔ چمن کی رونق اور اس کا حسن و جمال تو آنکھوں والے کے لیے ہے۔ اندھا کسی رونق اور کسی حُسن و جمال کا ادراک نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے چمن کا وجود ہی بے معنی ہے۔

[۳] یعنی جو لوگ انکار کا فیصلہ کر چکے ہیں، یا جنہوں نے شک ہی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا اپنے لیے پسند کر لیا ہے اُن کا معاملہ تو دوسرا ہے، مگر جن لوگوں کے دل کے دروازے یقین کے لیے بند نہیں ہوئے ہیں وہ جب اپنی پیدائش پر، اور اپنے وجود کی ساخت پر، اور زمین میں پھیلے ہوئے انواع و اقسام کے حیوانات پر غور کی نگاہ ڈالیں گے تو انہیں بے شمار علامات ایسی نظر آئیں گی جنہیں دیکھ کر یہ شبہ کرنے کی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہ رہے گی کہ شاید یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر بن گیا ہو، یا شاید اس کے بنانے میں ایک سے زیادہ خداؤں کا دخل ہو۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد اول، ص ۵۳۰، ۵۳۸۔ جلد دوم، ص ۵۲۶-۵۲۷۔ جلد سوم، ص ۲۰۱ تا ۲۰۴- ۲۶۹-۴۵۸-۵۰۲-۵۰۳-۵۹۳-۵۹۴-۷۴۲ تا ۷۴۶-۷۶۵-۷۶۶۔ جلد چہارم، السجدہ، حواشی ۱۲ تا ۱۸۔ یٰسین، آیات ۷۱ تا ۷۳۔ الزمر، آیت ۶۔ المومن، حواشی ۹۷-۹۸-۱۱۰)۔

[۴] رات اور دن کا یہ فرق و اختلاف اس اعتبار سے بھی ہے کہ دونوں پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک

میں جسے اللہ آسمان سے نازل فرماتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین کو جلا اٹھاتا ہے[۶]، اور ہواؤں کی گردش میں[۷] بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ یہ اللہ کی نشانیاں

دوسرے کے بعد آتے ہیں، اور اس اعتبار سے بھی کہ ایک روشن ہے اور دوسرا تاریک، اور اس اعتبار سے بھی کہ ایک مدت تک بڑی تدریج کے ساتھ دن چھوٹا اور رات بڑی ہوتی چلی جاتی ہے، پھر ایک وقت جا کر دونوں برابر ہو جاتے ہیں، پھر بتدریج دن بڑا اور رات چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ پھر دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ یہ مختلف قسم کے فرق و اختلاف جو رات اور دن میں پائے جاتے ہیں اور ان سے جو عظیم حکمتیں وابستہ ہیں، وہ اس بات کی صریح علامت ہیں کہ سورج اور زمین اور موجوداتِ زمین کا خالق ایک ہی ہے، اور اِن دونوں کُرّوں کو ایک ہی زبردست اقتدار نے قابو میں کر رکھا ہے، اور وہ کوئی اندھا بہرا بے حکمت اقتدار نہیں ہے بلکہ ایسا حکیمانہ اقتدار ہے جس نے بے اٹل حساب قائم کر کے اپنی زمین کو زندگی کی اُن بے شمار انواع کے لیے موزوں جگہ بنا دیا ہے جو نباتات، حیوانات اور انسان کی شکل میں اُس نے یہاں پیدا کی ہیں۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد دوم، ص ۲۹۶ - ۲۹۷، جلد سوم، ص ۶۰۶ - ۶۵۹، جلد چہارم، لقمان، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰۔ یٰسٓ آیت ۳۷، حاشیہ ۳۲)

[۵] رزق سے مراد یہاں بارش ہے، جیسا کہ بعد کے فقرے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے۔

[۶] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو جلد سوم، ص ۲۷۰ - ۲۷۱ - ۴۵۵ - ۴۵۶ - ۴۷۹ - ۵۸۹ - ۵۹۰ - ۴۸۸، ۷۴۹ - ۷۶۳، جلد چہارم، یٰسٓ حواشی ۲۶ تا ۳۱۔

[۷] ہواؤں کی گردش سے مراد مختلف اوقات میں زمین کے مختلف حصوں پر اور مختلف بلندیوں پر مختلف قسم کی ہوائیں چلنا ہے جن سے موسموں کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ دیکھنے کی چیز صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ زمین کے اوپر ایک وسیع کرۂ ہوائی پایا جاتا ہے جس کے اندر وہ تمام عناصر موجود ہیں جو زندہ مخلوقات کو سانس لینے کے لیے درکار ہیں، اور ہوا کے اسی لحاف نے زمین کی آبادی کو بہت سی آفاتِ سماوی سے بچا رکھا ہے۔ اِس کے ساتھ دیکھنے کی چیز یہ بھی ہے کہ یہ ہوا محض بالائی فضا میں بھر کر نہیں رہ گئی ہے

ہیں جنہیں ہم تمہارے سامنے ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ اب آخر اللہ اور اس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟ ۸

تباہی ہے ہر اُس جھوٹے بداعمال شخص کے لیے جس کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی

بلکہ وقتاً فوقتاً مختلف طریقوں سے چلتی رہتی ہے کبھی ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور کبھی گرم۔ کبھی بند ہو جاتی ہے اور کبھی چلنے لگتی ہے کبھی ہلکی چلتی ہے تو کبھی تیز، اور کبھی آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے کبھی خشک ہوا چلتی ہے اور کبھی مرطوب۔ کبھی بارش لانے والی ہوا چلتی ہے اور کبھی اُس کو اڑا لے جانے والی چل پڑتی ہے۔ یہ طرح طرح کی ہوائیں کچھ یونہی اندھا دھند نہیں چلتیں بلکہ اِن کا ایک قانون اور ایک نظام ہے جو شہادت دیتا ہے کہ یہ انتظام کمال درجہ حکمت پر مبنی ہے اور اس سے بڑے اہم مقاصد پورے ہو رہے ہیں۔ پھر اس کا بڑا گہرا تعلق اُس سردی اور گرمی سے ہے جو زمین اور سورج کے درمیان بدلتی ہوئی مناسبتوں کے مطابق گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے، اور مزید براں اس کا نہایت گہرا تعلق موسمی تغیرات اور بارشوں کی تقسیم سے بھی ہے۔ یہ ساری چیزیں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کسی اندھی فطرت نے اتفاقاً یہ انتظامات نہیں کر دیئے ہیں، نہ سورج اور زمین اور ہوا اور پانی اور نباتات اور حیوانات کے الگ الگ مدبّر ہیں، بلکہ لازماً ایک ہی خدا ان سب کا خالق ہے اور اسی کی حکمت نے ایک مقصدِ عظیم کے لیے یہ انتظام قائم کیا ہے، اور اسی کی قدرت سے یہ پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک مقرر قانون پر چل رہا ہے۔

۸ یعنی جب اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت پر خود اللہ ہی کے بیان کیے ہوئے یہ دلائل سامنے آجانے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اب کیا چیز ایسی آسکتی ہے جس سے انہیں دولتِ ایمان نصیب ہو جائے۔ اللہ کا کلام تو وہ آخری چیز ہے جس کے ذریعہ سے کوئی شخص یہ نعمت پا سکتا ہے۔ اور ایک اَن دیکھی حقیقت کا یقین دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جو معقول دلائل ممکن ہیں وہ اِس کلام پاک میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی انکار ہی کرنے پر تُلا ہوا ہو تو انکار کرتا رہے۔ اُس کے انکار سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔

ہیں، اور وہ اُن کو سنتا ہے، پھر پورے استکبار کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے اُن کو سنا ہی نہیں۹۔ ایسے شخص کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔ ہماری آیات میں سے کوئی بات جب اس کے علم میں آتی ہے تو وہ اُن کا مذاق بنا لیتا ہے۱۰۔ ایسے سب

۹۔ بالفاظِ دیگر، فرق اور بہت بڑا فرق ہے اُس شخص میں جو نیک نیتی کے ساتھ اللہ کی آیات کو کھلے دل سے سُنتا اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرتا ہے، اور اُس شخص میں جو انکار کا پیشگی فیصلہ کر کے سُنتا ہے اور کسی غور و فکر کے بغیر اپنے اسی فیصلے پر قائم رہتا ہے جو ان آیات کو سُننے سے پہلے وہ کر چکا تھا۔ پہلی قسم کا آدمی اگر آج ان آیات کو سُن کر ایمان نہیں لا رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کافر رہنا چاہتا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مزید اطمینان کا طالب ہے، اس لیے اگر اس کے ایمان لانے میں دیر بھی لگ رہی ہے تو یہ بات عین متوقع ہے کہ کل کوئی دوسری آیت اس کے دل میں اُتر جائے اور وہ مطمئن ہو کر مان لے۔ لیکن دوسری قسم کا آدمی کبھی کوئی آیت سُن کر بھی ایمان نہیں لا سکتا، کیونکہ وہ پہلے ہی آیاتِ الٰہی کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہے۔ اس حالت میں بالعموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جن کے اندر تین صفات موجود ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جھوٹے ہوتے ہیں اس لیے صداقت ان کو اپیل نہیں کرتی۔ دوسرے یہ کہ وہ بدعمل ہوتے ہیں، اس لیے کسی ایسی تعلیم و ہدایت کو مان لینا انہیں سخت ناگوار ہوتا ہے جو ان پر اخلاقی پابندیاں عائد کرتی ہو۔ تیسرے یہ کہ وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں ہمیں کوئی کیا سکھائے گا، اس لیے اللہ کی جو آیات انہیں سنائی جاتی ہیں ان کو وہ سرے سے کسی غور و فکر کا مستحق ہی نہیں سمجھتے اور ان کے سننے کا حاصل بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو نہ سننے کا تھا۔

۱۰۔ یعنی اُسی ایک آیت کا مذاق اڑانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ تمام آیات کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ مثلاً جب وہ سنتا ہے کہ قرآن میں فلاں بات بیان ہوئی ہے تو اسے سیدھے معنی میں لینے کے بجائے پہلے تو اس میں سے کوئی ٹیڑھ تلاش کر کے نکال لاتا ہے تاکہ اسے مذاق کا موضوع بنائے، پھر اس کا مذاق اڑانے کے بعد کہتا ہے: اجی ان کے کیا کہنے ہیں، وہ تو روز ایک سے ایک نرالی بات سنا رہے ہیں

لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔ اُن کے آگے جہنم ہے[۱۱]۔ جو کچھ بھی انہوں نے دنیا میں کمایا ہے اس میں سے کوئی چیز اُن کے کسی کام نہ آئے گی، نہ اُن کے وہ سرپرست ہی اُن کے لیے کچھ کر سکیں گے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر انہوں نے اپنا ولی بنا رکھا ہے[۱۲]۔ اُن کے لیے بڑا عذاب ہے

یہ قرآن سراسر ہدایت ہے، اور ان لوگوں کے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے جنہوں نے
اع اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا ع

وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اُس

ہیں، دیکھو فلاں آیت میں انہوں نے یہ دلچسپ بات کہی ہے۔ اور فلاں آیت کے لطائف کا تو جواب[۶] ہی نہیں ہے۔

[۱۱] اصل الفاظ ہیں مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ۔ وراء کا لفظ عربی زبان میں ہر اُس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو آدمی کی نظر سے اوجھل ہو، خواہ وہ آگے ہو یا پیچھے۔ اس لیے دوسرا ترجمہ ان الفاظ کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ان کے پیچھے جہنم ہے"۔ اگر پہلے معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بے خبر منہ اٹھائے اس راہ پر دوڑے جا رہے ہیں اور انہیں احساس نہیں ہے کہ آگے جہنم ہے جس میں وہ جا کر گرنے والے ہیں۔ دوسرے معنی لینے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ آخرت سے بے فکر ہو کر اپنی اس شرارت میں مشغول ہیں اور انہیں پتہ نہیں ہے کہ جہنم ان کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔

[۱۲] یہاں ولی کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک، وہ دیویاں اور دیوتا اور زندہ یا مُردہ پیشوا جن کے متعلق مشرکین نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جو شخص اُن کا متوسل ہو وہ خواہ دنیا میں کچھ ہی کرتا رہے، خدا کے ہاں اس کی پکڑ نہ ہو سکے گی، کیونکہ اُن کی مداخلت اسے خدا کے غضب سے بچا لے گی۔ دوسرے، وہ سردار اور لیڈر اور امراء و حکام جنہیں خدا سے بے نیاز ہو کر لوگ اپنا رہنما اور مطاع بناتے ہیں، اور آنکھیں بند کر کے ان کی پیروی کرتے ہیں، اور انہیں خوش کرنے کے لیے خدا کو ناخوش کرنے میں تأمل نہیں کرتے۔ یہ آیت ایسے سب لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ جب اس روش کے نتیجے میں جہنم سے ان کو سابقہ پیش آئے گا تو ان دونوں قسم کے سرپرستوں میں سے کوئی بھی انہیں بچانے

میں چلیں[13] اور تم اس کا فضل تلاش کرو[14] اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا،[15] سب کچھ اپنے پاس سے[16] ـــــ اِس میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔[17]

اے نبی، ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے دن آنے[18] کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے،[19] اُن کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی

کے لیے آگے نہ بڑھے گا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۃ الشوریٰ، حاشیہ ۶)۔

۱۳ے تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۶۳۰ - ۶۳۱۔ جلد سوم ص ۷۶۲۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۵۵، المومن، حاشیہ ۱۱۰۔ الشوریٰ حاشیہ ۵۴۔

۱۴ے یعنی سمندر میں تجارت، ماہی گیری، غواصی، جہازرانی اور دوسرے ذرائع سے رزقِ حلال حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

۱۵ے تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۸۸۔ جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۳۵۔

۱۶ے اس فقرے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا یہ عطیہ دنیا کے بادشاہوں کا سا عطیہ نہیں ہے جو رعیت سے حاصل کیا ہوا مال رعیت ہی میں سے کچھ لوگوں کو بخش دیتے ہیں، بلکہ کائنات کی یہ ساری نعمتیں اللہ کی اپنی پیدا کردہ ہیں اور اس نے اپنی طرف سے یہ انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہ ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں کوئی اللہ کا شریک ہے نہ انہیں انسان کے لیے مسخر کرنے میں کسی اور ہستی کا کوئی دخل۔ تنہا اللہ ہی اُن کا خالق بھی ہے اور اسی نے اپنی طرف سے وہ انسان کو عطا کی ہیں۔

۱۷ے یعنی اِس تسخیر میں اور اِن چیزوں کو انسان کے لیے نافع بنانے میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ نشانیاں اس حقیقت کی طرف کھلا کھلا اشارہ کر رہی ہیں کہ زمین سے لیکر آسمانوں تک کائنات کی تمام اشیاء اور قوتوں کا خالق و مالک اور مدبر و منتظم ایک ہی خدا ہے جس نے اُن کو ایک قانون کا تابع بنا رکھا ہے۔ اور وہی خدا انسان کا رب ہے جس نے اپنی قدرت اور حکمت اور رحمت سے اِن تمام اشیاء اور قوتوں کو انسان کی زندگی، اس کی معیشت، اس کی آسائش، اس کی ترقی اور اس کی تہذیب و تمدن کے لیے سازگار و مددگار بنا رکھا ہے۔ اور تنہا وہی خدا انسان کی عبودیت اور شکر گزاری اور نیاز مندی کا

کمائی کا بدلہ دے[۱۹]۔ جو کوئی نیک عمل کرے گا اپنے ہی لیے کرے گا، اور جو بُرائی کرے گا وہ آپ ہی اس کا خمیازہ بھگتے گا۔ پھر جانا تو سب کو اپنے رب ہی کی طرف ہے۔

مستحق ہے نہ کہ کچھ دوسری ہستیاں جن کا نہ ان اشیاء اور قوتوں کے پیدا کرنے میں کوئی حصہ، نہ انہیں انسان کے لیے مسخر کرنے اور نافع بنانے میں کوئی دخل۔

[۱۸] اصل الفاظ ہیں اَلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰہِ۔ لفظی ترجمہ یہ ہوگا کہ "جو لوگ اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے"۔ لیکن عربی محاورے میں ایسے موقع پر ایام سے مراد محض دن نہیں بلکہ وہ یادگار دن ہوتے ہیں جن میں اہم تاریخی واقعات پیش آئے ہوں۔ مثلاً ایام العرب کا لفظ تاریخ عرب کے اہم واقعات اور قبائل عرب کی اُن بڑی بڑی لڑائیوں کے لیے بولا جاتا ہے جنہیں بعد کی نسلیں صدیوں تک یاد کرتی رہی ہیں۔ یہاں اَیَّامَ اللّٰہ سے مراد کسی قوم کے وہ بُرے دن ہیں جب اللہ کا غضب اس پر ٹوٹ پڑے اور اپنے کرتوتوں کی پاداش میں وہ تباہ کر کے رکھ دی جائے۔ اسی معنی کے لحاظ سے ہم نے اس فقرے کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے"، یعنی جن کو یہ خیال نہیں ہے کہ کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہمارے اِن افعال پر ہماری شامت آئے گی، اور اسی غفلت نے اُن کو ظلم و ستم پر دلیر کر دیا ہے۔

[۱۹] مفسرین نے اس آیت کے دو مطلب بیان کیے ہیں، اور آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے۔ ایک یہ کہ اہلِ ایمان اس ظالم گروہ کی زیادتیوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ اُن کو اپنی طرف سے اُن کے صبر و حلم اور اُن کی شرافت کی جزا دے اور راہِ خدا میں جو اذیتیں انہوں نے برداشت کی ہیں اُن کا اجر عطا فرمائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اس گروہ سے درگزر کریں تاکہ اللہ خود اُس کی زیادتیوں کا بدلہ اُسے دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اُس وقت تک تھا جب تک مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ پھر جب اس کی اجازت آگئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے۔ "درگزر" کا لفظ اس

اِس سے پہلے بنی اسرائیل کو ہم نے کتاب اور حکم آور نبوت عطا کی تھی۔ اُن کو ہم نے عمدہ سامانِ زیست سے نوازا، دنیا بھر کے لوگوں پر انہیں فضیلت عطا کی، اور دین کے معاملہ میں انہیں واضح ہدایات دے دیں۔ پھر جو اختلاف اُن کے درمیان رونما ہُوا وہ (نا واقفیت کی

معنی میں کبھی نہیں بولا جاتا کہ جب آدمی کسی کی زیادتیوں کا بدلہ لینے پر قادر نہ ہو تو اس سے درگزر کرے، بلکہ اس موقع پر صبر، تحمل اور برداشت کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو چھوڑ کر جب یہاں درگزر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اہل ایمان انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود اُن لوگوں کی زیادتیوں کا جواب دینے سے پرہیز کریں جنہیں خدا سے بے خوفی نے اخلاق و آدمیت کی حدیں توڑ ڈالنے پر جری کر دیا ہے۔ اِس حکم کا کوئی تعارض اُن آیات سے نہیں ہے جن میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ جنگ کی اجازت کا تعلق اُس حالت سے ہے جب مسلمانوں کی حکومت کسی کافر قوم کے خلاف باقاعدہ کارروائی کرنے کی کوئی معقول وجہ پائے۔ اور عفو و درگزر کا حکم اُن عام حالات کے لیے ہے جن میں اہلِ ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے سابقہ پیش آئے اور وہ انہیں اپنی زبان و قلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ اِس حکم کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنے مقام بلند سے نیچے اتر کر ان پست اخلاق لوگوں سے اُلجھنے اور جھگڑنے اور ان کی ہر بیہودگی کا جواب دینے پر نہ اُتر آئیں۔ جب تک شرافت اور معقولیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مدافعت کرنا ممکن ہو، اس سے پرہیز نہ کیا جائے۔ مگر جہاں بات اِن حدود سے گزرتی نظر آئے وہاں چُپ سادھ لی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ مسلمان ان سے خود اُلجھیں گے تو اللہ اُن سے نمٹنے کے لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا۔ درگزر سے کام لیں گے تو اللہ خود ظالموں سے نمٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمل کا اجر عطا فرمائے گا۔

نمبر ۲۲ حکم سے مراد تین چیزیں ہیں۔ ایک، کتاب کا علم و فہم اور دین کی سمجھ۔ دوسرے، کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت۔ تیسرے، معاملات میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت۔

وجہ سے نہیں بلکہ، علم آجانے کے بعد ہوا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے[۲۲]۔ اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرما دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اس کے بعد اب اے نبی، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے[۲۳]۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اللہ کے مقابلے میں وہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آسکتے[۲۴]۔ ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، اور متقیوں کا ساتھی اللہ ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت اُن لوگوں کے لیے جو یقین لائیں[۲۵]۔

[۲۱] یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انہیں تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کر دی، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اُس زمانے میں دنیا کی تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لیے چُن لیا تھا کہ وہ کتاب اللہ کے حامل ہوں اور خدا پرستی کے علمبردار بن کر اٹھیں۔

[۲۲] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول: ص ۱۶۲-۱۶۳-۲۳۹-۲۴۰۔ جلد چہارم الشوریٰ حواشی نمبر ۲۲-۲۳۔

[۲۳] مطلب یہ ہے کہ جو کام پہلے بنی اسرائیل کے سپرد کیا گیا تھا وہ اب تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔ انہوں نے علم پانے کے باوجود اپنی نفسانفسی سے دین میں ایسے اختلافات برپا کیے، اور آپس میں ایسی گروہ بندیاں کر ڈالیں جن سے وہ اس قابل نہ رہے کہ دنیا کو خدا کے راستے پر بلا سکیں۔ اب اُسی دین کی صاف شاہ راہ پر تمہیں کھڑا کیا گیا ہے تاکہ تم وہ خدمت انجام دو جسے بنی اسرائیل چھوڑ بھی چکے ہیں اور ادا کرنے کے اہل بھی نہیں رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الشوریٰ، آیات ۱۳ تا ۱۵ مع حواشی ۲۰ تا ۲۶)

[۲۴] یعنی اگر تم انہیں راضی کرنے کے لیے اللہ کے دین میں کسی قسم کا ردو بدل کر دو گے تو اللہ کے مواخذہ سے وہ تمہیں نہ بچا سکیں گے۔

[۲۵] مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اور یہ شریعت دنیا کے تمام انسانوں کے لیے وہ روشنی پیش کرتی ہے جو حق اور باطل کا فرق نمایاں کرنے والی ہے۔ مگر اس سے ہدایت وہی لوگ پاتے ہیں جو اس کی صداقت پر یقین لائیں، اور انہی کے حق میں یہ رحمت ہے۔

خلافت اور ملوکیّت کا فرق

ابوالاعلیٰ مودودی

اس سے پہلے اِن صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ خلافت کس طرح کن مراحل سے گزرتی ہوئی آخر کار ملوکیت میں تبدیل ہوئی۔ اِس رُوداد کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا خلافتِ راشدہ جیسے بے نظیر مثالی نظام کی نعمت سے محروم ہو جانا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا جو اچانک بلا سبب رونما ہو گیا ہو، بلکہ اس کے کچھ اسباب تھے اور وہ بتدریج امت کو دھکیلتے ہوئے خلافت سے ملوکیت کی طرف لے گئے۔ اِس المناک تغیّر کے دَوران میں جتنے مراحل پیش آئے، ان میں سے ہر مرحلے پر اس کو روکنے کے امکانات موجود تھے، مگر امّت کی، اور درحقیقت پوری نوعِ انسانی کی یہ بدقسمتی تھی کہ تغیّر کے اسباب بہت زیادہ طاقتور ثابت ہوئے، حتیٰ کہ ان امکانات میں سے کسی ایک کا فائدہ بھی نہ اٹھایا جا سکا۔

اب ہمیں اِس سوال پر بحث کرنی ہے کہ خلافت اور ملوکیت کے درمیان اصل فرق کیا تھا، ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کے آجانے سے حقیقت میں کیا تغیّر واقع ہوا، اور اس کے کیا اثرات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر مترتب ہوئے۔

<u>تقررِ خلیفہ کے دستور میں تبدیلی</u> | اوّلین بنیادی تبدیلی اُس دستوری قاعدے میں ہوئی جس کے مطابق کسی شخص کو امّت کا سربراہ بنایا جاتا تھا۔

خلافتِ راشدہ میں وہ قاعدہ یہ تھا کہ کوئی شخص خود خلافت حاصل کرنے کے لیے نہ اُٹھے اور اپنی سعی و تدبیر سے برسرِ اقتدار نہ آئے، بلکہ لوگ جس کو امت کی سربراہی کے لیے موزوں سمجھیں، اپنے مشورے سے اقتدار اس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہیں بلکہ اُس کا سبب ہو

بیعت حاصل ہونے میں آدمی کی اپنی کسی کوشش یا سازش کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوں اور جب تک کسی کو لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے بیعت حاصل نہ ہو جائے وہ برسرِ اقتدار نہ آئے۔

خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی خود خلافت لینے کی برائے نام بھی کوئی کوشش نہ کی تھی، بلکہ جب خلافت ان کو دی گئی تب انہوں نے اس کو لیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لیے احق سمجھتے تھے لیکن کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لیے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔ لہٰذا ان کا محض اپنے آپ کو احق سمجھنا اس قاعدے کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ درحقیقت چاروں خلفا اس معاملہ میں بالکل یکساں تھے کہ ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت۔

ملوکیت کا آغاز اسی قاعدے کی تبدیلی سے ہوا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔ وہ بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی، مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا، وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لیے بیعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس وقت اگر ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے، بلکہ اس کے معنی خونریزی و بدنظمی کے تھے جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔ اسی لیے امام حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری (ربیع الاول ۴۱ھ) کے بعد تمام صحابہ و تابعین اور صلحائے امت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا۔

حضرت معاویہ خود بھی اس پوزیشن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اپنے زمانہ خلافت کے آغاز میں انہوں نے مدینہ طیبہ میں تقریر کرتے ہوئے خود فرما دیا:

اما بعد فانی واللہ ما ولیت امرکم حین ولیتہ وانا اعلم انکم لا تسرون بولایتی ولا تحبونہا وانی لعالم بما فی نفوسکم من ذالک ولکنی خالستکم بسیفی ہذا مخالسۃ ... وان لم تجدونی اقوم بحقکم کلہ فارضوا منی ببعضہ[1]۔

"بخدا میں تمہاری حکومت کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ تم میرے برسرِ اقتدار آنے سے خوش نہیں ہو اور اسے پسند نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے میں خوب جانتا ہوں، مگر میں نے اپنی اس تلوار کے زور سے تم کو مغلوب کر کے ... اب اگر تم یہ دیکھو کہ میں تمہارا حق پورا پورا ادا نہیں کر رہا ہوں تو تھوڑے پر مجھ سے راضی رہو۔"

اس طرح جس تغیر کی ابتدا ہوئی تھی، یزید کی ولی عہدی کے بعد سے وہ ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفیٰ کمال کے الغائے خلافت تک ایک دن کے لیے بھی اس میں تزلزل واقع نہ ہوا۔ اس سے جبری بیعت اور خاندانی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔ اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنے کا کوئی موقع نصیب نہ ہو سکا۔ لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسرِ اقتدار آتے رہے۔ بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔ بیعت کرنے یا نہ کرنے میں مسلمان آزاد نہ رہے۔ بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قابض ہونے اور قابض رہنے کے لیے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اوّل تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہوا تھا اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے۔ لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو اس کا نتیجہ ہرگز یہ نہ ہوتا تھا کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آگیا ہو وہ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ہٹ جائے۔

یہاں یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے کہ مسلمانوں کی آزادانہ مشاورت کے بغیر جو خلافت یا

---

[1] البدایہ والنہایہ لابن کثیر، ج ۸، ص ۱۳۲

امارت بزور قائم ہو گئی ہو وہ آئینی طور پر منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اصل سوال منعقد ہونے یا نہ ہونے کا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اسلام میں نصبِ خلافت کا صحیح طریقہ آیا وہ ہے جس سے خلفائے راشدین خلیفہ ہوئے، یا وہ جس سے حضرت معاویہ اور ان کے بعد کے لوگ خلیفہ بنے؟ ایک طریقہ کسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کی اسلام نے ہم کو ہدایت دی ہے۔ دوسرا طریقہ اسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کے مطابق اگر وہ کام کر ڈالا جائے تو اسلام اسے برداشت کر لیتے کی ہمیں صرف اس لیے تلقین کرتا ہے کہ اسے مٹانے اور بدلنے کی کوشش کہیں اس سے بھی زیادہ بدتر حالات پیدا نہ کر دے۔ بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان دونوں کو ایک درجے میں رکھ دے اور دعویٰ کرے کہ اسلام میں یہ دونوں طریقے یکساں جائز ہیں۔ ایک محض جائز نہیں بلکہ عین مطلوب ہے۔ دوسرا اگر جائز ہے تو قابلِ برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ اور مطلوب ہونے کی حیثیت سے۔

خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی | دوسری نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ دورِ ملوکیت کے آغاز ہی سے بادشاہ قسم کے خلفاء نے قیصر و کسریٰ کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیا اور اُس طریقے کو چھوڑ دیا جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے شاہی محلات میں رہنا شروع کر دیا۔ شاہی حرس (BODYGUARD) اُن کے محلوں کی حفاظت کرنے اور اُن کے جلو میں چلنے لگے۔ حاجب و دربان اُن کے اور عوام کے درمیان حائل ہو گئے۔ رعیت کا براہِ راست اُن تک پہنچنا اور اُن کا خود رعیت کے درمیان رہنا سہنا اور چلنا پھرنا بند ہو گیا۔ اپنی رعیت کے حالات معلوم کرنے کے لیے وہ اپنے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے جن کے ذریعہ سے کبھی کسی حکومت کو بھی صحیح صورتِ احوال کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ اور رعیت کے لیے بھی یہ ممکن نہ رہا کہ بلا توسط اُن تک اپنی حاجات اور شکایات لے کر جا سکیں۔ یہ طرزِ حکومت اُس طرز کے بالکل برعکس تھا جس پر خلفائے راشدین حکومت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ عوام کے درمیان رہے جہاں ہر شخص ان سے آزادی کے ساتھ مل سکتا تھا۔ وہ بازاروں میں چلتے پھرتے

تھے اور ہر شخص ان کا دامن پکڑ سکتا تھا۔ وہ پانچوں وقت عوام کے ساتھ انہی کی صفوں میں نمازیں پڑھتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں ذکر اللہ اور تعلیم دین کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کی پالیسی سے بھی عوام کو آگاہ کرتے تھے اور اپنی ذات اور اپنی حکومت کے خلاف عوام کے ہر اعتراض کی جواب دہی بھی کرتے تھے۔ اس طریقے کو حضرت علی نے کوفے میں اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی آخر وقت تک نباہا لیکن ملوکیت کا دور شروع ہوتے ہی اس نمونے کو چھوڑ کر روم و ایران کے بادشاہوں کا نمونہ اختیار کر لیا گیا۔ اس تبدیلی کی ابتدا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ بعد میں یہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔

بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی | تیسری اہم تبدیلی بیت المال کے متعلق خلفاء کے طرزِ عمل میں رونما ہوئی۔

بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس خدا اور خلق کی امانت ہے جس میں کسی کو من مانے طریقے پر تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ خلیفہ نہ اس کے اندر قانون کے خلاف کوئی چیز داخل کر سکتا ہے، نہ قانون کے خلاف اس میں سے کچھ خرچ کر سکتا ہے۔ وہ ایک ایک پائی کی آمد اور خرچ کے لیے جواب دہ ہے۔ اور اپنی ذات کے لیے وہ صرف اتنی تنخواہ لینے کا حق دار ہے جتنی ایک اوسط درجے کی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہو۔

دورِ ملوکیت میں بیت المال کا یہ تصور اس تصور سے بدل گیا کہ خزانہ بادشاہ اور شاہی خاندان کی ملک ہے، رعیت بادشاہ کی محض باجگزار ہے، اور کسی کو حکومت سے حساب پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ اس دور میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی، بلکہ ان کے گورنروں اور سپہ سالاروں تک کی زندگی جس شان سے بسر ہوتی تھی وہ بیت المال میں بیجا تصرف کے بغیر کسی طرح ممکن نہ تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں جب شاہزادوں اور امراء کی ناجائز املاک کا محاسبہ کیا، اس وقت انہوں نے خود اپنی، ۴۰ ہزار دینار سالانہ کی جائداد، جو انہیں اپنے والد عبدالعزیز بن مروان سے میراث میں ملی تھی، بیت المال کو واپس کی۔ اس جائداد میں فدک بھی شامل تھا جو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام خلفاء کے زمانہ میں بیت المال کی ملک رہا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے حضورؐ کی میراث میں آپ کی صاحبزادی تک کو دینے سے انکار کر دیا تھا، مگر مروان بن الحکم نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسے اپنی ملک اور اپنی اولاد کی میراث بنا لیا[۳۱]۔

یہ تو تھا بیت المال سے خرچ کے معاملہ میں ان حکمرانوں کا طرزِ عمل۔ اب بیت المال کی آمدنی کو دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ اس کے بارے میں بھی حلال و حرام کی تمیز ان کے ہاں اٹھتی چلی گئی۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اپنے ایک فرمان میں اُن ناجائز ٹیکسوں کی ایک فہرست دی ہے جو اُن کے پیش رو شاہانِ بنی امیہ کے زمانے میں رعایا سے وصول کیے جاتے تھے[۳۲]۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بیت المال کی آمدنی کے بارے میں شریعت کے قواعد کو کس بُری طرح توڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ جو غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تھے ان پر بھی اس بہانے جزیہ لگا دیا جاتا تھا کہ یہ محض جزیے سے بچنے کے لیے ایمان لا رہے ہیں، حالانکہ اصل وجہ اس فعل کی یہ تھی کہ اشاعتِ اسلام سے اُن کو بیت المال کی آمدنی کم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ابن اثیر کی روایت ہے کہ حجاج بن یوسف (عراق کے وائسرائے) کو اُس کے عاملوں نے لکھا کہ ذمّی کثرت سے مسلمان ہو ہو کر بصرہ و کوفہ میں آباد ہو رہے ہیں اور اس سے جزیہ و خراج کی آمدنی گھٹ رہی ہے۔ اس پر حجاج نے فرمان جاری کیا کہ ان لوگوں کو شہروں سے نکالا جائے اور ان پر حسبِ سابق جزیہ لگایا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں جب یہ نومسلم بصرہ و کوفہ سے نکالے جا رہے تھے تو وہ یا محمداہ، یا محمداہ پکار پکار کر روتے جاتے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جا کر اس ظلم پر فریاد کریں۔ اس صورتِ حال پر بصرہ و کوفہ کے علماء و فقہاء چیخ اٹھے اور جب یہ نومسلم روتے پیٹتے شہروں سے نکلے تو علماء و فقہاء بھی ان کے ساتھ روتے جاتے تھے[۳۳]۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو خراسان سے ایک وفد نے آکر اُن سے

---

[۳۱] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۶۴ - البدایہ، ج ۹، ص ۲۰۰ - ۲۰۸

[۳۲] الطبری، ج ۵، ص ۳۲۱ - ابن الاثیر ج ۴، ص ۱۶۳ [۳۳] ابن الاثیر ج ۴، ص ۷۹

شکایت کی کہ ہزارہا آدمی جو مسلمان ہوئے تھے، سب پر جزیہ لگا دیا گیا ہے، اور گورنر کے تعصب کا یہ حال ہے کہ وہ علانیہ کہتا ہے" اپنی قوم کا ایک آدمی مجھے دوسرے سو آدمیوں سے زیادہ عزیز ہے" اسی بنیاد پر حضرتِ موصوف نے الجراح بن عبداللہ الحکمی کو خراسان کی گورنری سے معزول کیا اور اپنے فرمان میں لکھا کہ" اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ تحصیلدار"۔[شہ]

آزادیٔ اظہارِ رائے کا خاتمہ | اس دور کے تغیرات میں سے ایک اور اہم تغیر یہ تھا کہ مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کر لی گئی، حالانکہ اسلام نے اسے مسلمانوں کا صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا، اور اسلامی معاشرہ و ریاست کا صحیح راستے پر چلنا اس پر منحصر تھا کہ قوم کا ضمیر زندہ اور اس کے افراد کی زبانیں آزاد ہوں، ہر غلط کام پر وہ بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔ خلافتِ راشدہ میں لوگوں کی یہ آزادی پوری طرح محفوظ تھی۔ خلفائے راشدین اس کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ اس پر لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اُن کے زمانہ میں حق بات کہنے والے ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں، تعریف و تحسین سے نوازے جاتے تھے، اور تنقید کرنے والوں کو دبایا نہیں جاتا تھا بلکہ ان کو معقول جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن دورِ ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کر دی گئیں۔ اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لیے کھولو، ورنہ چُپ رہو۔ اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زور دار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آتے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔

اِس نئی پالیسی کی ابتدا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں حضرت حُجر بن عدی کے قتل (۵۱ھ) سے ہوئی جو ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے امت میں ایک اونچے مرتبے کے شخص تھے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ

[شہ] الطبری، ج ۵، ص ۳۱۴۔ ابن الاثیر، جلد ۴، ص ۱۵۸۔ البدایہ، ج ۹، ص ۱۸۸۔

شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دل ہر جگہ ہی اس سے زخمی ہو رہے تھے مگر لوگ خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتے تھے۔ کوفہ میں حُجر بن عدی سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب میں حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہؓ کی مذمت شروع کر دی۔ حضرت مُغیرہ جب تک کوفہ کے گورنر رہے، وہ ان کے ساتھ رعایت برتتے رہے۔ ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہو گیا تو اُس کے اور ان کے درمیان کشمکش برپا ہو گئی۔ وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے۔ اسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نماز جمعہ میں تاخیر پر بھی اُس کو ٹوکا۔ آخر کار اس نے انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اِس فردِ جُرم پر لیں کہ "انہوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے، خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے ہیں، امیر المومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوا کسی کے لیے درست نہیں ہے، انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیر المومنین کے عامل کو نکال باہر کیا، یہ ابو تراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں، اُن پر رحمت بھیجتے ہیں اور اُن کے مخالفین سے اظہارِ براءت کرتے ہیں۔" ان گواہیوں میں سے ایک گواہی قاضی شریح کی بھی ثبت کی گئی، مگر انہوں نے ایک الگ خط میں حضرت معاویہ کو لکھ بھیجا کہ "میں نے سنا ہے آپ کے پاس حُجر بن عدی کے خلاف جو شہادتیں بھیجی گئی ہیں ان میں ایک میری شہادت بھی ہے۔ میری اصل شہادت حجر کے متعلق یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، دائماً حج و عمرہ کرتے رہتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے ہیں۔ ان کا خون اور مال حرام ہے۔ آپ چاہیں تو انہیں قتل کریں ورنہ معاف کر دیں۔"

اِس طرح یہ ملزم حضرت معاویہ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ قتل سے پہلے جلّادوں نے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علی سے براءت کا اظہار کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔" ان لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور حُجر نے کہا "میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا

جو رب کو ناراض کرے"۔ آخر کار وہ اور ان کے سات ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب عبدالرحمٰن بن حَسّان کو حضرت معاویہ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور اس کو لکھا کہ انہیں بدترین طریقہ سے قتل کرو۔ چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرا دیا۔[۶]

اس واقعہ نے امت کے تمام صلحاء کا دل دہلا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ کو یہ خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہ کو اس فعل سے باز رکھنے کے لیے پہلے ہی خط لکھا تھا۔ بعد میں جب ایک مرتبہ حضرت معاویہ ان سے ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا "اے معاویہ، تمہیں حُجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا"۔ حضرت معاویہ کے گورنر خراسان ربیع بن زیاد الحارثی نے جب یہ خبر سنی تو پکار اُٹھے کہ "خدایا اگر تیرے علم میں میرے اندر کچھ خیر باقی ہے تو مجھے دنیا سے اٹھا لے"۔[۷] حضرت حسن بصری فرماتے ہیں: "حضرت معاویہ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک، ان کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا، درانحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے، ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا، ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اُس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو، اور زانی کے لیے کنکر پتھر ہیں۔[۸] چوتھے ان کا حُجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا"۔[۹]

اس کے بعد لوگوں کی آواز کو جبر و ظلم سے دبانے کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ مروان بن الحکم

---

[۶] اس قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الطبری، ج ۴، ص ۱۹۰ تا ۲۰۷۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب ج ۱، ص ۱۳۵۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۳۴ تا ۲۴۲۔ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۵۰۔ ۵۵

[۷] الاستیعاب، ج ۱، ص ۱۳۵، الطبری، ج ۴، ص ۲۰۸

[۸] اس معاملہ کی تفصیل آگے آتی ہے۔

[۹] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۴۲۔ البدایہ، ج ۸، ص ۱۳۰

نے اپنی گورنری مدینہ کے زمانہ میں حضرت مسور بن مخرمہ کو اس قصور میں لات ماردی کہ انہوں نے اس کی ایک بات پر یہ کہہ دیا تھا کہ "آپ نے یہ بُری بات کہی ہے[۱۰]"۔ حجاج بن یوسف کو ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خطبہ لمبا کرنے اور نمازِ جمعہ میں حد سے زیادہ تاخیر کرنے پر ٹوکا تو اس نے کہا "میرا ارادہ ہے کہ تمہاری یہ دونوں آنکھیں جس سر میں ہیں اس پر ضرب لگاؤں[۱۱]"۔ عبدالملک بن مروان ۷۵ھ میں جب مدینہ گیا تو منبرِ رسولؐ پر کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ :

"میں اس اُمت کے امراض کا علاج تلوار کے سوا کسی اور چیز سے نہ کرونگا۔ . . . اب اگر کسی نے مجھے اِتَّقِ اللہ کہا تو میں اس کی گردن ماردوں گا[۱۲]"۔

ولید بن عبدالملک نے ایک دفعہ خطبۂ جمعہ کو اتنا طول دیا کہ عصر کا وقت بھی گزرنے لگا۔ ایک شخص نے اُٹھ کر کہا "امیر المومنین، وقت آپ کا انتظار نہ کرے گا، اور نماز میں اتنی تاخیر کر دینے پر آپ خدا کے سامنے کوئی عذر پیش نہ کر سکیں گے"۔ ولید نے جواب دیا "اے شخص تو نے سچ کہا، مگر ایسے راست گفتار آدمی کی جگہ وہ نہیں ہے جہاں تو کھڑا ہے"۔ چنانچہ اسی وقت شاہی باڈی گارڈ نے اسے قتل کر کے جنت پہنچانے کا انتظام کر دیا[۱۳]۔

یہ پالیسی رفتہ رفتہ مسلمانوں کو پست ہمت اور مصلحت پرست بناتی چلی گئی۔ خطرہ مول لے کر سچی بات کہنے والے ان کے اندر کم ہوتے چلے گئے۔ خوشامد اور ضمیر فروشی کی قیمت مارکیٹ میں چڑھتی اور حق پرستی و راست بازی کی قیمت گرتی چلی گئی۔ اعلیٰ قابلیت رکھنے والے، ایماندار اور باضمیر لوگ حکومت سے بے تعلق ہو گئے، اور عوام کا حال یہ ہو گیا کہ انہیں ملک اور اس کے

۱۰؎ الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۵۳

۱۱؎ الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۶۹۔ اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے۔ ج ۴، ص ۱۸۴

۱۲؎ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۰۴-۱۰۴۔ احکام القرآن للجصاص، ج ۱، ص ۸۲۔ فوات الوفیات، محمد بن شاکر الکتبی، ج ۲، ص ۳۳۔ مطبعۃ السعادۃ، مصر۔

۱۳؎ ابن عبد ربہ، العقد الفرید، ج ۱، ص ۶۲، لجنۃ التالیف والترجمہ، قاہرہ، ۱۹۴۰ء

معاملات سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں، مگر لوگ بس ان کی آمد و رفت کے تماشائی بن کر رہ گئے۔ عام لوگوں میں اس پالیسی نے جس سیرت و کردار کو نشوونما دینا شروع کیا اس کا ایک نمونہ وہ واقعہ ہے جو حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ سانحہ کربلا کے بعد ایک شخص چھپا کر مجھے اپنے گھر لے گیا اور میری خوب خاطر مدارات کی۔ اس کا حال یہ تھا کہ ہر وقت مجھے دیکھ دیکھ کر روتا تھا اور میں اپنی جگہ یہ سمجھتا تھا کہ میرے لیے اگر کسی شخص کے اندر وفا ہے تو وہ یہ شخص ہے۔ اتنے میں عبیداللہ بن زیاد کی یہ منادی سنی گئی کہ جو کوئی علی بن حسین کو ہمارے پاس پکڑ لائے گا اسے تین سو درہم انعام دیا جائے گا۔ یہ اعلان سنتے ہی وہ شخص میرے پاس آیا، میرے ہاتھ میری گردن سے باندھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں وہ مجھے ابن زیاد کے پاس لے گیا اور اس سے انعام حاصل کر لیا (طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۱۲)

عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ قضا (JUDICIARY) کی انتظامیہ سے آزادی کا اصول بھی اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں میں سے تھا۔ خلافت راشدہ میں قاضیوں کا تقرر اگرچہ خلفاء ہی کرتے تھے، مگر جب کوئی شخص قاضی مقرر ہو جاتا تھا تو اس پر خدا کے خوف اور اس کے اپنے علم و ضمیر کے سوا کسی کا کوئی دباؤ نہ رہتا تھا کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی عدالت کے کام میں دخل دینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ قاضی خود خلیفہ کے خلاف فیصلہ دے سکتے تھے اور دیتے تھے۔ مگر جب ملوکیت آئی تو بالآخر یہ اصول بھی ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ جن معاملات سے ان بادشاہ قسم کے خلفاء کو سیاسی اسباب، یا ذاتی مفاد کی بنا پر دلچسپی ہوتی تھی ان میں انصاف کرنے کے لیے عدالتیں آزاد نہ رہیں حتیٰ کہ شاہزادوں، گورنروں، قائدین اور شاہی محلات کے متوسلین تک کے خلاف مقدمات میں عدل کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ ایک بڑا سبب تھا اس بات کا کہ اس زمانہ میں صالح علماء بالعموم قضاء کا منصب قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے، اور جو عالم ان حکمرانوں کی طرف سے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے پر راضی ہو جاتا تھا، اسے لوگ شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے تھے۔ عدلیہ پر

انتظامیہ کی دست درازی یہاں تک بڑھی کہ گورنروں کو قاضیوں کے عزل و نصب کا اختیار دے دیا گیا[۴۰] حالانکہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ اختیارات خلیفہ کے سوا کسی کو حاصل نہ تھے۔

شوریٰ حکومت کا خاتمہ | اسلامی ریاست کے بنیادی قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ اُن لوگوں سے لیا جائے جن کے علم، تقویٰ، دیانت اور اصابت رائے پر امت کو اعتماد ہو۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں قوم کے بہترین لوگ ان کے مشیر تھے جو دین کا علم رکھنے والے اور اپنے علم و ضمیر کے مطابق پوری آزادی کے ساتھ بے لاگ رائے دینے والے ہوتے تھے۔ پوری قوم کو ان پر یہ اعتماد تھا کہ وہ حکومت کو کبھی غلط راستے پر نہ جانے دیں گے۔ یہی لوگ امت کے اہل الحل والعقد تسلیم کیے جاتے تھے۔ مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو یہ قاعدہ بھی بدل گیا۔ شوریٰ کی جگہ شخصی استبداد نے لے لی۔ حق شناس اور حق گو اہل علم سے بادشاہ، اور بادشاہوں سے یہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ اب بادشاہوں کے مشیر اگر تھے تو ان کے گورنر، قائدین، شاہی خاندان کے امراء، اور درباری لوگ تھے، نہ کہ وہ اہل الرائے اصحاب جن کی قابلیت اور دیانت و امانت پر امت کو اعتماد تھا۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک بڑھتے ہوئے تمدن میں پیش آنے والے قانونی مسائل میں فیصلہ دینے والا کوئی ایسا بااختیار ادارہ باقی نہ رہا جس کی طرف معاملات میں بوقت رجوع کیا جاسکتا ہو، جس کے اجماعی یا جمہوری فیصلے قانون اسلامی کے جزء بن جائیں، اور پھر ملک کی تمام عدالتیں انہی کے مطابق معاملات کے تصفیے کرنے لگیں۔ جہاں تک حکومت کے نظم و نسق، اہم داخلی و خارجی مسائل، اور عام پالیسی کے معاملات کا تعلق تھا، یہ شاہی کونسل ان کے فیصلے تو برے یا بھلے کر سکتی تھی لیکن قانونی مسائل کے فیصلے کرنا اس کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کی جرأت اگر یہ لوگ کرتے بھی تو امت کا اجتماعی ضمیر ان کے فیصلوں کو ہضم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ خود بھی اپنی حیثیت کو جانتے تھے، اور امت بھی ان کو فاسق و فاجر سمجھتی تھی۔

---

[۴۰] السیوطی، حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۸۸۔ المطبعۃ الشرفیہ، مصر، ۱۳۲۷ھ

ان کا کوئی دینی و اخلاقی وقار نہ تھا کہ ان کے فیصلے اسلامی قانون میں شامل ہو سکتے۔ علماء اور فقہاء نے اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر ان کی یہ کوشش انفرادی نوعیت کی تھی۔ ہر عالم اپنی درس و افتاء کی مسند سے قانونی احکام بیان کرتا تھا، اور ہر قاضی اپنے علم و فہم اور اپنے اجتہاد کے مطابق، یا کسی دوسرے عالم کے فتوے کی بنا پر، جس چیز کو بھی قانون سمجھتا تھا اس کے مطابق فیصلے کر دیتا تھا۔ اس سے قانون کے تسلسل و ارتقاء میں تو انقطاع واقع نہ ہوا، لیکن اسلامی مملکت میں ایک قانونی انارکی پیدا ہو گئی۔ پوری ایک صدی تک امت کے پاس کوئی ایسا ضابطہ نہ تھا جسے سند کی حیثیت حاصل ہوتی اور مملکت کی تمام عدالتیں اُس کی پیروی کر کے جزئیاتِ مسائل میں یکساں فیصلے کر سکتیں۔

نسلی و قومی عصبیتوں کا اُبھار | ایک اور عظیم تغیر جو اس دورِ ملوکیت میں رونما ہوا وہ یہ تھا کہ اس میں قوم، نسل، وطن اور قبیلہ کی وہ تمام جاہلی عصبیتیں پھر سے ابھر آئیں جنہیں اسلام نے ختم کر کے خدا کا دین قبول کرنے والے تمام انسانوں کو یکساں حقوق کے ساتھ ایک امت بنایا تھا۔ بنی امیہ کی حکومت ابتدا ہی سے ایک عرب حکومت کا رنگ لیے ہوئے تھی جس میں عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نومسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود تھا۔ اُس میں اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے نومسلموں پر جزیہ لگایا گیا، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس سے نہ صرف اشاعت اسلام میں شدید رکاوٹ پیدا ہوئی، بلکہ عجمیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اسلامی فتوحات نے دراصل اُن کو عربوں کا غلام بنا دیا ہے اور اب وہ اسلام قبول کر کے بھی اُن کے برابر نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ خرابی اور آگے بڑھی حالی تقاضی تھی کہ امام نماز مقرر کرتے ہوئے بھی یہ دیکھا جانے لگا کہ آدمی عرب ہے یا غیر عرب۔ کوفے میں حجاج بن یوسف نے حکم دے رکھا تھا کہ عرب کے سوا کوئی شخص نماز میں امام نہ بنایا جائے[۱۵]۔ حضرت سعید بن جُبیر جب گرفتار ہو کر آئے تو حجاج نے ان پر احسان جتایا کہ میں نے تم کو امام نماز

[۱۵] العقد الفرید، ج ۲، ص ۲۳۳

بنایا، حالانکہ یہاں عرب کے سوا کوئی امامت نہ کر اسکتا تھا۔[۱۶] عراق میں نبطیوں کے ہاتھوں پر مہریں لگائی گئیں۔ بصرے سے نومسلم عجمیوں کا وسیع پیمانے پر اخراج کیا گیا۔[۱۷] حضرت سعید بن جُبیر جیسے بلند مرتبہ عالم کو، جن کے پائے کے آدمی اُس وقت دنیائے اسلام میں دو چار سے زیادہ نہ تھے، جب کوفے کا قاضی مقرر کیا گیا تو شہر میں شور مچ گیا کہ عرب کے سوا کوئی شخص قضا کا اہل نہیں ہو سکتا۔ آخرکار حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے صاحبزادے ابو بُردہ کو قاضی بنایا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ ابنِ جبیر سے مشورہ لیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔[۱۸] حد یہ ہے کہ جنازوں پر بھی کسی عجمی کو نماز پڑھانے کے لیے آگے نہ کیا جاتا، اِلّا یہ کہ کوئی عرب لڑکا تک جنازہ پڑھانے کے لیے موجود نہ ہو۔[۱۹] کسی غیر عرب نومسلم لڑکی سے اگر کوئی شخص شادی کرنا چاہتا تو اسے لڑکی کے باپ یا اُس کے رشتہ داروں کو پیغام دینے کے بجائے اُس عرب سے رجوع کرنا پڑتا تھا جس کے وِلا (PATRONAGE) میں وہ عجمی خاندان ہو۔[۲۰] لونڈی کے پیٹ سے پیدا ہونے والے کے لیے عربوں میں ہجین (ہجین) کی اصطلاح رائج ہو گئی تھی، اور یہ خیال عام ہونے لگا تھا کہ وراثت میں اس کا حصہ عرب بیوی کی اولاد کے برابر نہیں ہو سکتا،[۲۱] حالانکہ شریعت کی رُو سے دونوں طرح کی اولاد کے حقوق برابر ہیں۔ ابو الفرج الاصفہانی کی روایت ہے کہ بنی سُلیم کے ایک شخص نے ایک عجمی نومسلم سے اپنی بیٹی بیاہ دی تو محمد بن بشیر الخارجی نے مدینہ جاکر گورنر سے اس کی شکایت کی، اور گورنر نے فوراً زوجین میں تفریق کرا دی، اس نومسلم کو کوڑے لگوائے، اور اس کا سر، ڈاڑھی اور ابروئیں منڈوا کر اسے ذلیل کیا۔[۲۲]

۱۶؎ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان، ج ۲، ص ۱۱۵۔ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، قاہرہ، ۱۹۴۸

۱۷؎ العقد الفرید، ج ۳، ص ۴۱۶ - ۴۱۷

۱۸؎ ابنِ خلکان، ج ۲، ص ۱۱۵

۱۹؎ العقد الفرید، ج ۳، ص ۴۱۳ ۲۰؎ حوالہ مذکور

۲۱؎ ابنِ قُتیبہ، عیون الاخبار، ج ۴، ص ۶۱ طبع اول، مطبعۃ دار الکتب، مصر، ۱۹۲۸ء

۲۲؎ الاغانی، ج ۱۴، ص ۱۵۰۔ المطبعۃ المصریہ، بولاق، مصر، ۱۲۸۵ھ

یہی وہ طرزِ عمل تھا جس نے عجم میں شعوبیت (عجمی قوم پرستی) کو جنم دیا، اور اسی کی بدولت خراسان میں بنی امیہ کے خلاف عباسیوں کی دعوت کو فروغ نصیب ہوا۔ عجمیوں میں عربوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہو چکی تھی، عباسی داعیوں نے اسے بنی اُمّیہ کے خلاف استعمال کیا، اور انہوں نے اس امید پر عباسیوں کا ساتھ دیا کہ ہمارے ذریعہ سے انقلاب ہو گا تو ہم عربوں کا زور توڑ سکیں گے۔

بنی امیہ کی یہ پالیسی صرف عرب و عجم کے معاملے ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ خود عربوں میں بھی اس نے سخت قبائلی تفریق برپا کر دی۔ عدنانی اور قحطانی، یمانی اور مُضَری، اَزد اور تمیم، کلب اور قَیس کے تمام پرانے جھگڑے اس دور میں پھر سے تازہ ہو گئے۔ حکومت خود قبیلوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتی تھی اور اس کے عرب گورنر اپنی اپنی ولایتوں میں پورے تعصب کے ساتھ اپنے قبیلے کو نوازتے اور دوسرے قبیلوں کے ساتھ بے انصافیاں کرتے تھے۔ خراسان میں اسی پالیسی کی وجہ سے یمنی اور مُضری قبائل کی کشمکش اس حد تک بڑھی کہ عباسی داعی ابومسلم خراسانی نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا کر اُموی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا۔ حافظ ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ میں ابنِ عَساکر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں عباسی فوجیں دمشق پر چڑھی چلی آ رہی تھیں اُس وقت بنی اُمیہ کے دارالسلطنت میں یمانی اور مُضَری کی عصبیت پوری شدت کے ساتھ بھڑکی ہوئی تھی، حتیٰ کہ ہر مسجد میں دو محرابیں الگ الگ تھیں، اور جامع مسجد میں دو منبروں پر دو امام خطبے دیتے اور دو جماعتوں کی الگ الگ امامت کراتے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں سے کوئی کسی کے ساتھ نماز تک پڑھنے کے لیے تیار نہ تھا۔[۲۳]

(باقی)

۲۳؎ البدایہ، جلد ۱۰، ص ۴۵۔

مؤتمرِ اسلامی کی قراردادیں

ترجمہ: عمر فاروق مودودی

پچھلے دنوں رابطۂ عالمِ اسلامی کی دعوت پر ۱۵ سے ۲۲ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ / ۱۷ اپریل ۱۹۶۵ء تک جو مؤتمر مکہ معظمہ میں ہوئی تھی، اس میں حسبِ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں:

دعوتِ اسلامی | اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دینے کا فریضہ مسلمانوں کے اہم ترین واجبات میں سے ہے اور یہ فرض ان کے افراد، جماعتوں، قوموں اور حکومتوں، سب پر عائد ہوتا ہے، کیونکہ اسلام وہ دین ہے جسے اللہ کے رسول محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین بن کر تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لائے تھے، اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کو اسلام سے روشناس کرایا جائے تاکہ اس دین کا جو حق مسلمانوں کے ذمے ہے وہ ادا ہو اور وہ اللہ کے بندوں تک اس کا پیغام پہنچا کر اس کے حضور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوں۔

اس دعوت کو پھیلانے کے لیے ضروری ہے کہ زمان اور مکان کی مناسبت سے تمام ممکن وسائل استعمال کیے جائیں، اور قرآن کی زبان، عربی کے علاوہ دنیا کی تمام زندہ زبانوں میں نشرو اشاعت کا کام کیا جائے۔ مؤتمر دیکھ رہی ہے کہ اس زمانے میں الحاد، اباحیت اور فکری ارتداد کے علمبرداروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے، ان کے مخربِ ایمان وسائل و ذرائع بھی روزافزوں ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے وہ ادب، ثقافت، تصنیف و تالیف اور نشرو اشاعت کے تمام طریقوں سے کام لے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مؤتمر، مسلمان قوموں اور ان کی حکومتوں کا یہ فرض سمجھتی ہے کہ وہ اِن تباہ کن تحریکات کا مقابلہ انہیں کے سے ذرائع اور

وسائل کے ساتھ کریں۔ مؤتمر اس سلسلے میں مندرجہ ذیل سفارشات کرتی ہے:

(۱) امر واقعہ کا اعتراف کرنے کے ساتھ مؤتمر یہ امید رکھتی ہے کہ مملکت عربیہ سعودیہ اور اس کے حکمران مسلسل یہ کوشش جاری رکھیں گے کہ حرمین شریفین اس دعوت کے لیے مرکز ہدایت، اور تمام دنیا کے لیے روشنی کا مینار بن جائیں۔ یہ سرزمین ایک ایسے زندہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے بہترین مقام ہے جس میں اسلامی طرز زندگی اپنی تمام خصوصیات، فضائل اور مظاہر کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ اس طرح کا ایک معاشرہ اگر یہاں قائم ہو اور اسے اسلام کے اصولوں کے مطابق پروان چڑھایا جائے تو دوسرے اسلامی ملکوں پر اس کے بڑے گہرے اثرات پڑیں گے کیونکہ وہاں سے آنے والا ہر شخص، اس معاشرے کی خوبیوں سے متمتع اور صفات سے متاثر ہو کر واپس جائے گا۔

(۲) مؤتمر یہ سفارش کرتی ہے کہ ایک مرکزی ادارۂ دعوت و ارشاد مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں قائم کیا جائے جس کا کام دعوت و ارشاد کے لیے کارکن تیار کرنا ہو۔

(۳) مختلف اسلامی ممالک کے علماء، فقہاء اور محققین پر مشتمل ایک مجلس قائم کی جائے جو مسلمانوں کے روزمرہ مسائل کا مطالعہ کرے اور اسلام اور مسلمانوں کو اپنی زندگی میں جن مشکلات سے بھی سابقہ پیش آ رہا ہے اُن کو حل کرے۔

(۴) مختلف زبانوں میں ایسی کتابیں تالیف اور منتخب کی جائیں جو ذہنوں کو بگاڑنے والے نظریات و افکار سے پاک ہوں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے مدارس میں ہر درجے کی تعلیم کے لیے نصاب کے کام آ سکیں۔

(۵) مسلمان حکومتوں سے رابطہ پیدا کر کے ان کو اس امر پر آمادہ کیا جائے کہ وہ باہمی اتفاق کے ساتھ اسلامی اصولوں اور مقاصد کے مطابق صالح تعلیم و تربیت کا ایک نظام تیار کریں نیز مؤتمر یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ اس مقصد کے لیے مجالس مشاورت اور اجتماعات منعقد کیے جائیں جن میں مسلمان ماہرین فن جمع ہو کر اس مسئلے پر غور و فکر کریں، اور رابطہ اس کا انتظام کرے۔

(۶) ایسے اسلامی اخبارات، رسائل اور کتابوں کی سرپرستی کی جاتے جو اس مقصد کے

لیے مفید ہوں

(۷) ریڈیو صوت الاسلام (مکہ) کے آلات اور نشریات کو زیادہ طاقتور بنایا جائے اور اس کے پروگراموں کو مختلف زبانوں میں نشر کیا جائے تاکہ وہ ہر جگہ سنے جاسکیں اور مفید ثابت ہوسکیں۔ اس غرض کے لیے ایک مجلسِ علمی کی نگرانی میں اسلامی موضوعات پر عالمِ اسلام کی بہترین تحریروں اور تقریروں کا انتخاب کیا جائے۔ نیز دوسرے مسلم ممالک کے ریڈیو اور نشریات کے مراکز کو بھی اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے ہاں اسلامی نشریات کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنائیں اور باہمی مشاورت اور تبادلۂ خیالات سے دعوتِ اسلامی کے پروگراموں کے لیے ایک متفقہ طریقِ کار اور پالیسی وضع کریں۔

(۸) مکہ مکرمہ میں علماء کا ایک بورڈ قائم کیا جائے جو حجاج کے لیے مناسکِ حج اور دوسرے فرائض و واجبات کی تعلیم کا بندوبست کرے اور اس مقصد کے لیے واعظوں اور معلموں کی ایک تنظیم قائم کرے۔

(۹) طواف و زیارت کرانے والے معلمین کو اسلامی آداب کے مطابق تعلیم و تربیت دینے کے لیے تربیتی کورس جاری کیے جائیں۔ اسی طرح جو لوگ عارضی طور پر یہ کام کرتے ہیں، ان کو بھی تربیت دی جائے۔

(۱۰) عربی زبان کو قرآن مجید کی زبان کی حیثیت سے تمام مسلم اقوام کے لیے عالمی زبان کا درجہ دیا جائے اور کوشش کی جائے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے کو تمام مسلمان ملکوں میں لازمی قرار دے دیا جائے کیونکہ دینِ اسلام کے فہمِ صحیح کا دارومدار اسی پر ہے۔

(۱۱) مفید اسلامی کتابوں کے انتخاب، ان کی دوبارہ طباعت، دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے اور اشاعت کے لیے ایک بورڈ قائم کیا جائے۔

(۱۲) اسلامی ملکوں کی توجہ ایسی مطبوعات پر پابندی لگانے کی طرف مبذول کرائی جائے جن کا مقصود براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اسلام کی بیخ کنی کرنا یا اس کے خلاف بدگمانیاں

پیدا کرنا، یا مسلمانوں میں فرقہ وارانہ عصبیت بھڑکانا ہو۔

(۱۳) جن اسلامی کتابوں کو مختلف حلقوں سے حسنِ قبول کی سند مل چکی ہے اور ان کا مفید ہونا مسلم ہو چکا ہے، ان کی دوبارہ طباعت اور دوسری زبانوں میں ترجمے اور اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔

(۱۴) تبلیغی موضوعات، عقائد، اخلاق اور اجتماعیات پر تعلیمی لیکچر ٹیپ ریکارڈ کر کے تقسیم کیے جائیں تاکہ عالمِ اسلامی کے دور دراز گوشوں میں بھی مسلمان ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

(۱۵) کوشش کی جائے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان (حافظوا علی الصلوات ...) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم (مروا ابناءکم بالصلوٰۃ وھم ابناء سبع ...) کی تعمیل میں اسلامی ممالک کے تمام مدارس اپنے حدود میں اقامتِ صلاۃ کا التزام کریں۔

(۱۶) کوشش کی جائے کہ ہر اس اخبار میں جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، کچھ نہ کچھ جگہ دعوتِ اسلامی کے لیے مخصوص ہو۔

(۱۷) کوشش کی جائے کہ اسلامی ممالک کے ہر ریڈیو اسٹیشن سے ایسے علماء کی نگرانی میں، جو اس کام کے اہل ہوں، دعوتِ اسلامی کا پروگرام نشر کیا جائے اور مخربِ اخلاق گانوں، قصے کہانیوں اور ڈراموں کے نشریات پر پابندی لگائی جائے۔

(۱۸) اس امر کی بھی کوشش کی جائے کہ مسلمان ممالک میں لڑکیوں کے لیے الگ اور مخصوص ابتدائی و ثانوی مدارس اور کالج قائم کیے جائیں تاکہ اسلامی روایات کے مطابق تمام تعلیمی مراحل میں انہیں لڑکوں سے الگ رکھا جاسکے اور ان کی تربیت خالص اسلامی طریقے پر کی جاسکے۔

(۱۹) صیامِ عیدین اور بقیہ قمری مہینوں میں باقاعدگی اور ہم آہنگی پیدا کرنے، مطاف کی توسیع کے سلسلے میں مقامِ ابراہیم کو تبدیل کرنے اور اس طرح کے دوسرے فقہی مسائل کو جو رابطہ کے سامنے رکھے گئے ہیں، طے کرنے کے لیے مختلف مذاہب کے کبار فقہاء کی ایک مجلس

قائم کی جائے۔

(۲۰) صہیونی اثر و نفوذ اور مشنری، اشتراکی، قادیانی، بہائی، فری میسنری یا اس طرح کی دوسری تخریبی تحریکوں کی سرگرمیوں اور سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلامی اور عرب ملکوں کو متحد کیا جائے۔

(۲۱) افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی شہرت اور نیک نامی کو نقصان پہنچانے کے لیے استعمار، عیسائی مشنریوں اور صہیونی مراکز کی جانب سے جو پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، اس کا توڑ کرنے کے لیے ایک مضبوط پروپیگنڈہ تنظیم قائم کی جائے۔

(۲۲) اسلامی ممالک سے مدرسین اور واعظین افریقہ اور ان ممالک میں مسلسل بھیجے جاتے رہیں جہاں ان کی ضرورت سمجھی جائے

(۲۳) تمام افریقی ممالک کے مسلمان طلبہ کے لیے تعلیمی وظائف مختص کیے جائیں۔

(۲۴) افریقہ اور ایشیا کی پسماندہ مسلم آبادیوں میں فی الحال جو مساجد، ادارے اور کالج قائم ہیں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔

(۲۵) افریقی ممالک میں جو مالی ذرائع مسلمانوں کے پاس ہیں ان کے نفع بخش استعمال کی حوصلہ افزائی کرنے اور قرضے جاری کرنے کے لیے ایک مالی فاؤنڈیشن قائم کی جائے اور اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومتوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ افریقہ میں اُبھرتی ہوئی مسلمان حکومتوں کو قرضے اور امدادیں دیں۔

(۲۶) مسلمان مدرسوں، انجینئروں اور ڈاکٹروں کو افریقہ میں کام کرنے پر آمادہ کیا جائے تاکہ افریقی قوموں کے ترقیاتی کاموں اور استیصالِ امراض اور ہسپتالوں کے قیام کے پروگراموں میں ان کی مدد کی جا سکے۔

(۲۷) رابطۂ عالمِ اسلامی کی نگرانی میں افریقہ میں بین الملکتی اسلامی کانفرنسوں کے انعقاد کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے مسائل پر تبادلۂ خیال ہو سکے۔

ثقافتی امور | مجلس برائے ثقافتی امور کی جانب سے پیش کردہ رپورٹوں کا جائزہ لینے کے بعد موتمر اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ طویل دورِ استعمار نے اگرچہ مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے پر بُرے اثرات چھوڑے ہیں تاہم ان کی ثقافت سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ ان اثرات کے مظاہر مختصراً یہ ہیں۔

(۱) مغربی افکار کی ترجمان بے شمار تحریکوں نے مسلمانوں کو زندگی کے مختلف شعبوں میں طرزِ فکر کے اختلاف اور رجحانات کے تصادم کی طرف دھکیلا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام دشمنی میں انہوں نے مسلمانوں کو اخلاقی، اجتماعی، سیاسی، اقتصادی، غرض یہ کہ ہر میدان میں اسلام سے دُور ہٹانے کی کوشش کی ہے۔

(۲) مسلمانوں کے اندر ان قدیم جاہلی طور طریقوں اور رسوم و رواج کی حفاظت کی گئی جن کا دین سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔

(۳) دینی اور عصری علوم کی تعلیم کے لیے بیک وقت متعدد اور باہم دگر متصادم نظام تعلیم موجود رہے۔

ان نقائص کے تدارک اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور انہیں صحیح معنوں میں اسلامی زندگی کی طرف واپس لے جانے کے لیے موتمر مندرجہ ذیل سفارشات کرتی ہے:

(۱) مشترک اساس پر ایک ثقافتی نظام کی تعمیر کی ضرورت ہے جس میں ایک ہی روح جاری و ساری ہو اور جس پر تمام مسلمان مجتمع ہو سکیں تاکہ انہیں اسلامی اصول و عقائد سے متصادم فکری و ثقافتی نظاموں کی یلغار سے بچایا جا سکے۔ ہماری حقیقی آزادی محض سیاسی آزادی نہیں ہے بلکہ اغیار کی تہذیبی غلامی سے نکل کر زندگی کے عصری تقاضوں کو کتاب و سُنّت کی رہنمائی میں پورا کرنا ہے۔

(۲) تعلیمی نصاب کی کتابیں بالخصوص ابتدائی اور ثانوی درجوں کے لیے اس طرح تیار کی جائیں کہ ان کا درسی مواد اسلامی رنگ کا حامل ہو، تاکہ نئی نسلیں اسلامی فضا میں پروان

چڑھیں اور اُن لادینی افکار کے اثرات سے محفوظ رہیں جو آج تاریخ، فلسفہ اور اجتماعیات وغیرہ علوم و فنون اور ان کے تعلیمی مواد میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ صرف اسی طرح اِن علوم کے درسی مواد اور دینی تعلیم و تربیت میں مطابقت اور یک رنگی پیدا ہو سکتی ہے۔

(۳) اِس جدید طرز پر نصابِ تعلیم اور درسی کتابوں کی تیاری کے لیے ایسے ایسے افراد سے بھی مدد لی جائے جو اسلامی ثقافت اور جدید تعلیمی مواد پر جامع نظر رکھتے ہوں، اور کوشش کی جائے کہ مسلمان ممالک میں اور خصوصاً مملکتِ سعودیہ عربیہ میں ایسے جامع ماہرین کے بورڈ بھی اس غرض کے لیے بنائے جائیں۔

(۴) تمام درجاتِ تعلیم میں، ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی کے درجے تک، اور اختصاصی تعلیم کی تمام شاخوں میں ہر ایک کی مخصوص ضروریات کے مطابق اسلام کے اصول و مبادی پڑھانے کی طرف توجہ کی جائے اور اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

(الف) یہ تعلیم جدید طریقے اور شوق انگیز اسلوب سے ہر درجے کی مناسبت ملحوظ رکھتے ہوئے دی جائے۔ (اس غرض کے لیے دینی تعلیم کے طریقے اور دینی تربیت کے اسالیب طے کرنے کے لیے ماہرین سے مدد لی جانی چاہیے اور ایسے بورڈ بنائے جانے چاہییں جو غور و خوض کر کے اس مقصد کے لیے خطوطِ کار تجویز کریں)

(ب) جزئیات اور تفصیلات سے زیادہ توجہ بنیادی عقائد اور کلیات اور ایسے اصول کی طرف ہونی چاہیے جو مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ باہمی یک جہتی پیدا کریں۔ اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی اہتمام ہونا چاہیے کہ طلبہ کے اندر مختلف مذاہبِ اسلامیہ میں اصولی وحدت کا شعور اور فقہی اختلافات میں رواداری کا جذبہ پیدا ہو اور وہ فرقہ وارانہ تعصبات ختم ہوں جو مسلمانوں کو دشمنوں کے مقابلے میں کمزور کر رہے ہیں اور انہیں آپس کے جزئی اختلافات میں اُلجھا کر دشمنوں کو تقویت دے رہے ہیں۔

(ج) دینی تعلیم دیتے ہوئے موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ایسے دلنشین اور

منطقی انداز میں پیش کیا جائے کہ طلبہ کے دلوں سے شکوک و شبہات از خود دُور ہو جائیں ایک طرف اسلام کے مخالف مذاہب اور فلسفوں کے نقائص ان پر واضح ہو جائیں اور دوسری طرف زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کی خوبیاں ان کے سامنے آجائیں۔

(د) اس تعلیم کو اتنے ہی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے کہ طلبہ دین کو از راہِ عقل قبول کریں بلکہ اُسے ان کے اندر دین کے ساتھ والہانہ محبت و شیفتگی پیدا کرنی چاہیے اور ان کے قلب و نظر کو بیدار کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے عملی وسائل سے مدد لی جائے۔ مثال کے طور پر مساجد میں دینی شعائر قائم کرنے کی طرف توجہ کرنی چاہیے، بالخصوص نماز کا اہتمام تو تمام مدارس، تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں ہونا چاہیے۔

(ھ) تعلیم و تربیت کے میدان میں اساتذہ اور ٹریننگ کالجوں کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پیشِ نظر اساتذہ کے تربیتی ادارے اسلامی بنیادوں پر استوار کیے جانے چاہییں۔ اور ان میں دینی تربیت اور اس کے طریقوں اور اسلامی تہذیب و ثقافت پر خاص زور دینا چاہیے۔ چونکہ مملکتِ عربیہ سعودیہ سب سے زیادہ اس بوجھ کے اٹھانے کی اہل ہے اس لیے اس پر واجب ہے کہ وہ نمونے کا ایک تربیتی کالج قائم کرے جس میں تمام اسلامی ممالک سے اسلامی تعلیم کے ماہرین جمع کیے جائیں۔

(۵) تمام اسلامی ممالک کے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں عالمِ اسلامی کی موجودہ حالت اور اس کے جغرافیے سے متعلق معلومات طلبہ کو بہم پہنچائی جائیں اور اسے شاملِ نصاب کیا جائے۔

(۶) اسلام اور اسلامی تہذیب کی تاریخ پڑھانے کی طرف خاص توجہ کی جائے۔ مسلمانوں کی تاریخی میراث اور اس کے آثار کو زندہ کرنے اور اپنے اسلاف کے یادگار کارناموں سے نئی نسلوں کو آگاہ کرنے کی فکر کی جائے، اور ایسے بورڈ بنائے جائیں جو دشمنوں کی تحریفات سے پاک کر کے صحیح اسلامی تاریخ مرتب کریں جس میں وہ غلط بیانیاں راہ نہ پائیں جو دشمنانِ اسلام کی کتابوں اور ان کے ترجموں میں پائی جاتی ہیں۔

(۷) گھریلو اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ لڑکیوں کی اسلامی طریق پر تعلیم و تربیت کی جائے

اور انہیں غیر اسلامی تعلیمی نظاموں سے محفوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں ان کے لیے درجہ بدرجہ تعلیمی نصاب تیار کیا جائے جس کا مقصود لڑکیوں کو ان کے فطری فرائض کی بجا آوری کے لیے تیار کرنا ہو۔

(۸) اسلامی ممالک اور بالخصوص افریقی ممالک میں اسلامی ثقافت اور عربی زبان کی نشر و اشاعت پر توجہ دی جائے۔ اس مقصد کے لیے تعلیمی وظائف جاری کیے جائیں، علمی مشن بھیجے جائیں، معلمین اور مبلغین بھیجے جائیں، غرض یہ کہ وہاں اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت کے لیے ہر قسم کی مدد بہم پہنچائی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کو ان کے دین اور عقائد سے برگشتہ کرنے کے لیے جو تحریکیں سرگرم کار ہیں، ان کا راستہ روکا جائے۔

(۹) غیر مسلم حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ اپنے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم اور عربی زبان کی تدریس کی سہولتیں دیں اور اس مقصد کے لیے مدارس میں اوقات مخصوص کریں۔ اس کے ساتھ ہی مؤتمر یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ غیر مسلم حکومتیں اپنے مسلمان محکومین پر وہ عقائد اور تعلیمات نہ ٹھونسیں جو اسلام سے متصادم ہوں۔

بیرونی ممالک میں تعلیم

مؤتمر یہ چیز تشویش کے ساتھ دیکھتی ہے کہ جو مسلمان طالب علم بیرونی ممالک میں حصولِ تعلیم کی غرض سے جاتے ہیں، انہیں طرح طرح کی ترغیبات و تحریصات اور افکار و نظریات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور چونکہ وہ ابھی اپنی عمر کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں، دینی تعلیم و تربیت بھی پوری طرح ملی نہیں ہوتی اور وہ فطری صلاحیت بھی ابھی ان میں پیدا نہیں ہوتی جو آدمی کو بے راہ روی سے باز رکھتی ہے، اس لیے ان کے گمراہ ہو جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ اس خرابی کا سدباب کرنے کے لیے مؤتمر مندرجۂ ذیل سفارشات کرتی ہے

(۱) بیرونی ممالک میں صرف اعلیٰ تعلیم کے حصول کی اجازت دی جائے۔ اس مقصد کے لیے طالب علموں کے انتخاب میں پوری چھان بین کی جائے اور دورانِ قیام میں موزوں تعلیمی ماہرین کے

مشن وغیرہ بھیج کر ان کی نگرانی کی جاتی رہے۔

(۲) طلبہ کے لیے ہاسٹل بنائے جائیں اور ان میں ایسے وسائل اختیار کیے جائیں جن سے وہاں اسلامی فضا پیدا ہو سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ہاسٹل ان شہروں میں بنائے جائیں جہاں مسلمان طلبہ بڑی تعداد میں جاتے ہیں تاکہ سب کے سب ایک ہی جگہ رہ سکیں۔

اسلامی اتحاد: عالم اسلام ایک جسم کی مانند ہے جس کے اجزا کو اسلام از روئے نصِ قرآن اِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّاَنَا رَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْنِ، باہمدگر مربوط رکھتا ہے۔ مسلمان قوموں پر جو سیاسی و فکری حملے ہوتے رہتے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر کے اور ایک دوسرے کے پشتیبان بن کر ایک طاقتور عالمی بلاک قائم کریں جو ان کے عقائد اور مفادات کی حفاظت کرے اور عالمی امن کے قیام اور انسانیت کی فلاح و ترقی میں حصہ لے۔ ایسے ایک بلاک کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کے بجائے اسلامی عقیدے اور مصلحتِ امّت کی بنیاد پر ایک برادری وجود میں آئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مختلف مسلمان حکومتیں سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی میدانوں میں باہمی رشتے زیادہ سے زیادہ استوار کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ ان حقائق کی روشنی میں مؤتمر مندرجہ ذیل اقدامات کی ضرورت محسوس کرتی ہے:

(۱) مسلم بلاک کے تخیّل کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایسا مطالعاتی مواد تیار کیا جائے جو ایک طرف تمام مسلمان قوموں کے لیے اس بلاک کی افادیت ثابت کرے اور دوسری طرف یہ بھی بتائے کہ اس بلاک کی تشکیل میں رکاوٹ ڈالنے والے امور کیا ہیں، مثلاً دینی جذبے کی کمی، نوع بنوع مذہبی نعروں کی بہتات، متصادم علاقائی مفادات، غیر ملکی اثر و نفوذ اور دخیل افکار و نظریات۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا جائے کہ ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے کون کون سے وسائل استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ پھر اس امر کی وضاحت بھی اس میں کر دی جائے کہ اس تحریک کا مقصود غیر مسلم دنیا کے خلاف دھڑے بندی نہیں ہے بلکہ بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک

پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہے تاکہ وہ ایک ایسی قوت بن سکیں جو عالمی امن کے قیام میں مساعد ہو اور انسانیت کی فلاح میں حصہ لے۔ اس قسم کے مواد کی طباعت اور اشاعت رابطہ کا کام ہے۔

(۲) رابطہ عالم اسلامی کے ذریعہ سے عامۂ مسلمین میں وحدت کا شعور پیدا کرنے کی مہم کو منظم کیا جائے اور ایسا علمی مواد تیار کیا جائے جس میں عالم اسلامی کے متعلق مکمل اعداد و شمار دیئے جائیں اور اسے تمام ممکن ذرائع سے پھیلایا جائے۔ موتمر رابطۂ عالم اسلامی کے جنرل سیکرٹیریٹ سے یہ سفارش کرتی ہے کہ وہ قابل اور صاحب صلاحیت افراد پر مشتمل ایک ایگزیکٹو باڈی بنائے جس کا کام ہر سال حج کے لیے آنے والے وفود کے ساتھ ربط قائم کرنا ہوگا جیسا کہ پہلی موتمر نے فیصلہ کیا تھا۔ موتمر یہ بھی سفارش کرتی ہے کہ ایگزیکٹو باڈی کو حج کے لیے آنے والے علماء، انجینئروں، ڈاکٹروں اور دوسرے اصحابِ علم و فن سے ملاقاتوں اور تعارف و تعاون کے سلسلے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے۔

(۳) اکابر علماء اور اہل الرائے حضرات کی ایک مجلس اس غرض کے لیے بنائی جائے کہ جہاں بھی مسلمانوں کے درمیان اختلافات رونما ہوں وہاں وہ باہمی جھگڑے طے کرانے اور خوں ریزیوں کو روکنے کی کوشش کرے۔

(۴) مختلف زبانوں میں عالم اسلام کی ایک گائڈ بک شائع کی جائے جس میں ہر علاقے کے مسلمانوں کے حالات درج کیے جائیں اور جو جو اسلامی تنظیمیں وہاں کام کر رہی ہیں، ان کی سرگرمیوں کی نوعیت، ڈاک کے پتے اور ان کے سربراہوں کے نام اس میں درج کیے جائیں۔

(۵) رابطۂ عالم اسلامی ثقافت، رسل و رسائل اور اقتصادیات کے میدانوں میں مسلمان قوموں کی فنی کانفرنسیں منعقد کرانے کا بندوبست کرے۔

(۶) عالم اسلام اس وقت جن خطرات سے دوچار ہے، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے موتمر اپنے سابقہ فیصلے پر پھر زور دیتی ہے کہ ایک جمعیت امم اسلامیہ قائم کی جائے اور وہ جمعیت مسلمان قوموں کے مابین ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ تعاون پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

(۷) مسلمانوں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی جارہی ہیں، ان پر جو ظلم وستم روا رکھے جارہے ہیں، ان کے حقوق جس طرح غصب کیے جارہے ہیں اور ان کی بیخ کنی کرنے کے لیے ان کے خلاف جو سازشیں کی جارہی ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مؤتمر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ رابطہ کے سیکرٹری جنرل کی سرکردگی میں ممتاز ماہرین پر مشتمل ایک خاص شعبہ قائم کیا جائے۔ یہ شعبہ اُن مسلمانوں کے حالات پر ایک مبسوط اور دقیق رپورٹ تیار کرے جو اس وقت غیر مسلم اقتدار کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی بتاسکے کہ وہ کون سے اقدامات ہیں جو اس کی نظر میں اصلاح احوال کے لیے ضروری ہیں اور جن کے ذریعے مختلف علاقوں میں مبتلائے مصیبت مسلمانوں کو ان کے غصب شدہ حقوق واپس دلائے جاسکتے ہیں، انہیں خوش حالی اور امن سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے اور انہیں اس قابل بنایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنے اسلاف کے ورثے کی حفاظت کرسکیں۔

اس موقع پر موتمر ان دس کروڑ مسلمانوں کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتی جو سوویٹ روس اور قوم پرست چین کے زیر سایہ زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔ موتمر پُرامن بقاءِ باہم کے اُس اصول کا واسطہ دے کر جس پر شرق وغرب کی امن پسند قومیں متفق ہیں مطالبہ کرتی ہے کہ ان مسلمانوں کا مسئلہ مستقل طور پر حل کیا جائے اور اُن خطرات کا سدباب کیا جائے جنہوں نے ان کے وجود ہی کو مخدوش کر دیا ہے۔

(۸) موتمر حکومت ترکیہ کے ان اقدامات کو سراہتی ہے جو اس نے اپنے اردگرد کے کے مسلمان ممالک سے قریبی دوستانہ تعلقات کی تجدید کے لیے کیے ہیں۔ خاص طور پر قضیہ فلسطین کے سلسلے میں ترکی نے جو قدم اٹھائے ہیں موتمر انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے موتمر کے نزدیک یہ اقدامات عالم اسلام کی توقعات کے عین مطابق ہیں اور اس امر کا نیک شگون ہیں کہ عظیم ترک قوم ایک مرتبہ پھر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے کمربستہ ہوئی ہے۔

اقتصادی اور اجتماعی امور

اقتصادی اور اجتماعی امور کے بارے میں پیش کردہ بیانات

اور رپورٹوں کا مطالعہ کرنے کے بعد موتمر نے مندرجہ ذیل فیصلے کیے :-

(۱) موتمر قرار دیتی ہے کہ اسلام ایک مستقل بالذات اور کامل نظام ہے اور وہ بنی نوع انسان کے تمدنی مسائل کا حل اس طرح کرتا ہے کہ فرد کا تعلق معاشرے کے ساتھ جوڑ کر ان دونوں کے حقوق اور فرائض کا تعین کر دیتا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مشترک ذمہ داری میں منسلک کر دیتا ہے۔ ایک طرف فرد کو ایک مقدس وجود اور زندہ معاشرے کی ایک ناقابل شکست اساس قرار دے کر اس کی انسانیت اور آزادی کو تحفظ دیتا ہے اور دوسری طرف ایک اسلامی معاشرے کے خدوخال کا نقشہ اس طور پر کھینچ دیتا ہے کہ نہ اس کی نشوونما پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ تہذیب و تمدن کی دوڑ میں وہ پیچھے رہتا ہے۔

(۲) موتمر دیکھ رہی ہے کہ مسلمان ممالک اس وقت ایک چوراہے پر کھڑے ہوئے ہیں اور اقتصادی پس ماندگی دور کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس کشمکش میں وہ کبھی مختلف سوشلسٹ نظریات کا رخ کرتے ہیں اور کبھی سرمایہ دارانہ جمہوریت کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ درآنحالیکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی ان کو ساحل مراد تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ سوشلزم اور سرمایہ دارانہ جمہوریت دونوں انسانی مسائل حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے جیسا کہ عالمی امن کے قیام میں ان کی ناکامی کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے۔ موتمر کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے لیے اسلامی تعلیمات کے اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

(۳) بکثرت اقتصادی مسائل ایسے ہیں جن کا جواب ایک ماہر اقتصادیات ہی دے سکتا ہے اس لئے موتمر سفارش کرتی ہے کہ علماء اور ماہرین اقتصادیات کا ایک مستقل بورڈ قائم کیا جائے جو یا تو خود ان مسائل کا حل پیش کرے یا دوسرے ماہرین کے حوالے کرے کہ وہ ایک مقررہ مدت کے اندر غور و فکر کر کے ان کا حل پیش کریں۔ اس کے بعد بورڈ منتخب ماہرین کی ایک مجلس طلب کر کے ان جوابات پر بحث و مباحثہ اور نظر ثانی کرائے اور پھر موتمر کے سامنے رکھے تاکہ وہ اس سلسلے میں مناسب فیصلے کرے۔ موتمر کے نزدیک یہ معاملہ بہت اہم اور فوری عمل درآمد کا مقتضی ہے۔

(۴) چونکہ جدید اقتصادیات کا بنیادی اصول پیداوار بر پیمانہ کبیر ہے اور بیشتر مسلمان ممالک چھوٹے چھوٹے رقبوں پر مشتمل ہیں اور فرداً فرداً اس قابل نہیں ہیں کہ بڑے پیمانے پر پیداوار کر سکیں اس لئے موتمر مسلمان ممالک سے یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ مشترک اقتصادی پالیسی کا اصول اپنا لیں۔ موتمر سفارش کرتی ہے کہ اس مسئلے کو مسلمان ممالک کی مجوزہ چوٹی کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔

(۵) موتمر اعلان کرتی ہے کہ اسلام میں انفرادی ملکیت اور انفرادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے اور وہ اسی طرح محترم ہیں جس طرح انسانی جان شریعت کے مقررہ کردہ حدود کے اندر محترم ہے۔ اور یہ کہ اموال فی الاصل اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں جن کے مالک نیابتاً اس کے بندے بنتے ہیں تاکہ وہ زندگی کے بقاء کے لیے شریعت کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق انہیں خرچ کریں اور اپنے مصالح کے لیے ان میں تصرف کریں، مگر ایسے طریقے پر کہ معاشرے کے مصالح کو اس سے نقصان نہ پہنچے۔

(۶) اسلامی معاشرے میں ہر فرد کے لئے اضطراری بیروزگاری، مرض، جسمانی اور ذہنی ناکارگی بیوگی، بڑھاپے اور ہر اس صورت میں جب کہ کوئی شخص ناگہانی اسباب کے تحت اپنے وسائل معاش سے محروم ہو جاتے، کفالت کی ضمانت موجود ہے۔

رسائل و مسائل

بعض احادیث کی تشریح

سوال: احادیث میں قرآن مجید کی بعض آیات کے بارے میں بڑے بڑے وعدے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آیت الکرسی ہی کو لیجیے۔ اس کے متعلق بخاری، مسلم وغیرہ میں معمولی اختلاف سے یہ بیان موجود ہے کہ جو کوئی اس کو پڑھے اس کے لیے ایک فرشتہ بحیثیت محافظ و نگران مقرر کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح چوری سے حفاظت اور مال کے محفوظ رہنے کا مضمون بھی مشہور ہے۔ مگر اس کے باوجود بعض اوقات چوری بھی ہو جاتی ہے اور آدمی کو نقصان بھی پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح احادیث میں مذکور ہے کہ جو شخص یہ کلمات پڑھے گا اسے کوئی چیز گزند نہیں پہنچا سکتی: "بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شیئ فی الارض ولا فی السماء" مقصد صرف اس قدر ہے کہ باوجود ان شہادتوں کے معاملات کا وقوع مطابق وعدہ نہیں ہوتا۔ ازراہِ مہربانی اس الجھن کو حل فرما دیں۔

یہی حال رزق وغیرہ کے وعدوں میں نظر آتا ہے۔ متقی کو رزق کی فراہمی کا جا بجا ذکر آیا ہے مگر کئی ایسے آدمی نظر آتے ہیں جو باوجود نہایت متقی ہونے کے نہایت تنگدستی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آخر یہ کیا وجہ ہے کہ ایمانداری سے رزق کمانے والوں کی حالت تو بہت کمزور ہے مگر بددیانت لوگوں کی آمدنی وافر ہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر قلبی اطمینان کو بہت ضعف پہنچتا ہے اور ایمانداری کی طرف لوگوں کی توجہ بہت کم رہ جاتی ہے۔ عموماً لوگ غلط طریقے استعمال کرکے کامیاب ہو جاتے ہیں اور

شریعت کی پابندی کرنے والے لوگ جو ایسے غلط طریقوں سے بچتے ہیں، کامیاب نہیں ہونے پاتے۔

امید ہے آپ ان الجھنوں کو دُور فرمائیں گے۔

جواب۔ آیت الکرسی کے جو اثرات احادیث میں بیان کیے گئے ہیں، نیز بسم اللہ الذی لا یضر مع اسمہ شیئ کی جو تاثیر بیان کی گئی ہے، یہ محض الفاظ کو زبان سے گزار دینے کے نتائج نہیں ہیں، بلکہ ان چیزوں کو سوچ سمجھ کر جو شخص پڑھے اور ان کے معانی کو اپنے طرزِ فکر اور کردار میں جذب کرے اس کے حق میں فی الواقع ان چیزوں کے وہی اثرات مترتب ہوتے ہیں جو بیان کیے گئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لیجیے کہ جو شخص ان چیزوں کو پڑھے گا وہ آفات سے اور ان کے طبعی نتائج سے لازماً محفوظ ہو جائے گا، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے اندر اتنی زبردست قوت پیدا ہو جائے گی کہ کسی صورتِ حال میں بھی اس کا نفس شکست خوردہ نہ ہو سکے گا۔ حوادثِ طبعی تو ہر انسان کو پیش آتے ہیں مگر کمزور طبیعت کا انسان ان سے مات کھا جاتا ہے اور مضبوط عزم و ارادہ کا انسان ان سے مغلوب نہیں ہوتا۔

متقی کو رزق کی فراہمی کے وعدے جہاں آتے ہیں، وہاں رزق سے مراد رزقِ حلال ہے نہ کہ رزقِ حرام۔ متقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی حرام راستے سے روزی حاصل کرنے کا سرے سے خواہشمند ہی نہ ہو اور اس بات کا عزم کرلے کہ میں جو کچھ بھی حاصل کروں گا حلال راستے ہی سے حاصل کروں گا۔ ایسے شخص کے لیے اللہ رزق کے دروازے بند نہیں کر دیتا، اور ایسا شخص خود بھی اس تھوڑے یا بہت رزق پر قانع و مطمئن رہتا ہے جو حلال کے راستے سے خدا اس کو دے۔ آپ رزق کی جن فراوانیوں کا ذکر کر رہے ہیں وہ رزق نہیں بلکہ غلاظت ہے جسے کھانے کا ایک متقی خیال بھی نہیں کر سکتا۔

کچھ سلاسلِ تصوّف کے بارے میں

سوال: سلسلۂ تصوف میں چند اصطلاحات معروف و مروّج ہیں قطب، غوث، ابدال اور قیوم۔ قرآن و حدیث میں ان کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس کے متعلق جناب اپنی ذاتی تحقیق سے آگاہ فرمائیں نیز تصوّف کے سلاسلِ اربعہ کے متعلق بھی اپنی رائے عالیہ سے مستفیض فرمائیں۔

ایک مشہور روایت ہے کہ حضرت حسن بصری کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خرقہ عطا فرمایا تھا اور یہ تمام طُرقِ فقر حضرت علی سے شروع ہوتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ملّا علی قاری کی موضوعاتِ کبیر ہے۔ روایت خرقہ کے متعلق موصوف کی تحقیق ملاحظہ فرما کر آپ اس پر مدلّل تبصرہ فرمائیں۔ عبارت یہ ہے:

حدیث لبس الخرقۃ للصوفیۃ وکون الحسن البصری لبسہا من علیؓ۔ قال ابن دحیۃ وابن الصلاح انہ باطل، وکذا قال العسقلانی انہ لیس فی شیءٍ من طرقہا ما یثبت ولم یرد فی خبرٍ صحیحٍ ولا حسنٍ ولا ضعیفٍ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم البس الخرقۃ علی الصورۃ المتعارفۃ بین الصوفیۃ لاحدٍ من الصحابۃ ولا امر احداً من الصحابۃ بفعل ذالک وکل ما یُروی من ذالک صریحاً فباطلٌ۔ قال ثم ان من الکذب المفتری قول من قال ان علیاً البس الخرقۃ الحسن البصری فان ائمۃ الحدیث لم یثبتوا للحسن من علی سماعاً فضلاً عن ان یلبسہ الخرقۃ۔

ترجمہ: "صوفیہ کے خرقہ پہننے کی حدیث، اور یہ قصّہ کہ حسن بصری کو حضرت علیؓ نے خرقہ پہنایا تھا، ابن دحیہ اور ابن صلاح کہتے ہیں کہ یہ باطل ہے۔ اور ابن حجر عسقلانی کہتے ہیں کہ جن طریقوں سے یہ روایت بیان کی جاتی ہے ان میں سے کوئی بھی ثابت نہیں ہے، اور

کسی صحیح یا حسن بلکہ ضعیف روایت میں بھی یہ بات نہیں آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے صوفیہ کے متعارف طریقے پر صحابہ میں سے کسی کو خرقہ پہنایا ہو یا کسی صحابی کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہو۔ اس سلسلے میں جو کچھ روایت کیا جاتا ہے وہ باطل ہے۔ پھر ابنِ حجر کہتے ہیں کہ یہ بات بھی جھوٹ ہے کہ حضرت علی نے حضرت حسن بصری کو خرقہ پہنایا تھا۔ ائمۂ حدیث کے نزدیک تو حضرت حسن کا حضرت علی سے سماع تک ثابت نہیں ہے کجا کہ ان سے خرقہ پہننا"

صوفیہ کے درمیان سبع لطائف کا ایک تدریجی اور ارتقائی طریقہ مروج ہے۔ کتبِ احادیث میں یہ طریقِ ذکر و فکر مروی نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بھی رائے گرامی تحریر فرمائیں۔

میں جناب کی توجہ ایک اچھی تجویز کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میری رائے ہے کہ جس طرح مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے اکابر و اعیان اور حکّامِ سلطنت امرا و وزرا کی طرف پر از نصائح مکتوبات لکھ کر تبلیغِ حق کا فریضہ ادا کیا، آپ بھی یہ طریقِ کار اختیار فرمائیں۔

جواب۔ تصوّف کی جن اصطلاحات کا آپ نے ذکر کیا ہے ان میں سے صرف ابدال کا ذکر حضرت علیؓ کے ایک قول میں ملتا ہے۔ باقی رہے غوث، قطب اور قیوم، تو ان کا کوئی ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات، یا صحابہ و تابعین کے اقوال میں نہیں ملتا۔ اور خود ابدال کے متعلق بھی جو عام تصورات صوفیہ کے ہاں پائے جاتے ہیں ان کی طرف کوئی اشارہ حضرت علیؓ کے اس قول میں نہیں ہے جس سے یہ اصطلاح لی گئی ہے۔

تصوّف کے سلاسلِ اربعہ کے متعلق میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ ان سلسلوں کی ابتدا ایسے بزرگوں سے ہوئی ہے جو یقیناً صلحاءِ امت میں سے تھے اور ان کا مقصود بھی تزکیہ و اصلاح تھا جس کے ایک پاکیزہ مقصد ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جس طرح

مسلمانوں کی زندگی کے دوسرے شعبے تدریج اختلاط کے شکار ہوتے اور ان میں صحیح و غلط کی آمیزش ہوتی چلی گئی، اسی طرح یہ سلسلے بھی اپنی اصلی ابتدائی پاکیزہ حالت پر باقی نہیں رہ سکے ہیں۔ لیکن خدا کے فضل سے قرآن و سنت دنیا میں محفوظ ہیں۔ ان کی رہنمائی میں ہم جہاں اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں میں صحیح و غلط کے درمیان تمیز کر سکتے ہیں، سلاسلِ تصوف کے افکار و اعمال میں بھی یہ تمیز ممکن ہے۔

حضرت حسن بصریؒ کو حضرت علیؓ سے خرقہ ملنے کی جو روایت اہلِ تصوف کے ہاں مشہور ہے، علمِ حدیث کی رُو سے اس کی کوئی اصل نہیں۔ آپ نے ملّا علی قاری کی جو عبارت نقل کی ہے وہ بالکل درست ہے۔

صوفیہ کے ہاں تزکیہ و تعلیم و تربیت کے جو طریقے رائج ہیں، ان میں سے اکثر ان کے اپنے اجتہاد پر مبنی ہیں۔ کم ہی چیزیں ایسی ہیں جن کا نشان عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ و تابعین میں ملتا ہو۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے طریقے پر اربابِ اقتدار سے مراسلت کرنے کا جو مشورہ آپ نے دیا ہے اس پر میں ضرور عمل کرتا اگر اس گروہ میں کوئی صاحب مجھے ایسے ملتے جو مجھ سے حسنِ ظن اور مخلصانہ تعلق بھی رکھتے ہوں، تاکہ میرا ان سے خطاب کرنا مفید ہو سکے، اور اس کے ساتھ وہ اس گروہ میں کچھ نہ کچھ با اثر بھی ہوں کہ ان کی کوششوں سے کوئی اصلاح کی صورت بن سکے۔ حضرت مجددؒ نے اپنے مکاتیب میں جن لوگوں سے بھی خطاب فرمایا ہے ان کے اندر یہ دونوں شرطیں پائی جاتی تھیں۔

مطبُوعات

پاکستانی کلچر تالیف: جناب جمیل جالبی صاحب۔ شائع کردہ: مشتاق بک ڈپو نزد اردو کالج، تنسیلڈن روڈ، کراچی ملا۔ قیمت آٹھ روپے صفحات ۲۴۴۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ چند کتابیں جنہوں نے پامال موضوعات سے ہٹ کر اس ملک کے سوچنے سمجھنے والوں کو دعوتِ فکر دی ہے، اُن میں زیرِ تبصرہ کتاب خاص اہمیت رکھتی ہے ہمیں فاضل مصنف کے بہت سے افکار و نظریات سے اختلاف ہے لیکن ہم اس کے ساتھ اس حقیقت کے بھی معترف ہیں کہ انہوں نے اپنے خیالات کو بڑی جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے خصوصًا اس کا وہ حصّہ جس میں انہوں نے ذہنی آزادی کا ذکر کیا ہے بڑا قابلِ قدر ہے۔

یہ کتاب چونکہ وقت کے ایک اہم مسئلے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس پر ہم ذرا تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

فاضل مصنف شعوری یا غیر شعوری طور پر ہیگل اور مارکس سے متاثر ہیں۔ کتاب کے آغاز میں انہوں نے ہمیں بتایا ہے کہ افکار و نظریات میں ٹھہراؤ نہیں ہوتا اور وہ برابر ارتقائی منازل طے کرتے رہتے ہیں۔ پھر انہوں نے اس ارتقاء کے محرکات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اُن کا حاصلِ مطالعہ یہ ہے کہ "توانائی کی تسخیر و تصرف انسانی کلچر کی ترقی کا بنیادی عمل ہے۔ توانائی کی تسخیر و تصرف کارکردگی کے ساتھ آلات کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں اور آلات کلچر کو متاثر و متشکل کرتے ہیں جیسے آلات ہونگے اسی طرح کا کلچر ہوگا (ص۲۰۳)

یہ نظریہ مارکسی طرزِ فکر کا چربہ ہے تاریخ کے اس جبری ارتقاء کو بنیاد بنا کر انہوں نے مسلم سوسائٹی، ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ اور اسلام پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا خیال یہ ہے

کہ مسلم معاشرے نے تاریخ کے عملی ارتقاء کو ہر منزل پر نظر انداز کیا اور اس بنا پر وہ انحطاط کا شکار ہوا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی ہر اُس تحریک کو بڑی شدت سے کوسا ہے جس نے انہیں معاشرتی اور فکر ونظر کی تبدیلیوں کو قبول کرنے میں حزم واحتیاط کا مشورہ دیا ہے۔ فاضل مصنف اس بات کے سختی سے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو "عصری روح" (AGE SPRIT) سے نبرد آزما ہونے کے بجائے اُس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اپنے اسی اساسی نظریہ کے تحت انہوں نے مختلف تحریکات مثلاً دیوبند، علی گڑھ، طلوعِ اسلام اور جماعت اسلامی کا جائزہ لیا ہے۔ اُن کی نظر میں مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ مفید علی گڑھ کی تحریک ہے جس کے بانی سرسید نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے نئے اُبھرتے ہوئے تقاضوں سے نہ صرف آشنا کیا بلکہ انہیں ان سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے مدیر ترجمان القرآن کے افکار ونظریات پر بھی تنقید کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> "مولانا مودودی زندگی کو ارتقائی قوت نہیں سمجھتے۔ ان کا نظریہ زمان ناقص ہے۔ وہ سکونی تصور کائنات وحیات کے قائل ہیں۔ اسی سبب سے وہ زندگی اور معاشرے کو ایک مکان سے مشابہ سمجھتے ہیں نہ کہ درخت سے۔ درخت ایک نامیاتی وجود ہے جو نمو پاتا ہے اور اس کا تمام تغیر اس کے اندر سے ظہور پذیر ہوتا ہے جب کہ اس کے مقابلے پر مکان ایک غیر نامیاتی وجود ہے اور اس کا تغیر خارجی محرکات کا مرہونِ منت ہے۔ مولانا مودودی جب اس نظریہ کو اسلامی تاریخ پر منطبق کرتے ہیں تو اس نظریہ پر پہنچتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کا دور واپس لایا جاسکتا ہے اور اسی نمونے پر ایک اسلامی معاشرے کی تعمیر ہوسکتی ہے۔ ان کے نزدیک اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اندرونی طور پر کوئی نشوونما نہیں ہوئی ہے۔ اسی بنا پر وہ خلافتِ راشدہ کے

بعد کے تاریخی اَدوار کو اسلامی تاریخ سے نہایت آسانی کے ساتھ حذف کر دیتے ہیں اور اسے اسلام کے بجائے صرف مسلمانوں کی تاریخ قرار دیتے ہیں۔ بظاہر اُن کا نظریہ اجتہاد زندگی کے تغیر کو تسلیم کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے مگر اس کی اصل حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ زندگی کو بھی ایک دیئے ہوئے نقشے کے مطابق ایک مکان کی طرح متغیر اور متبدل کر سکتے ہیں۔ اُن کا تجربہ بظاہر عقلی معلوم ہونے کے باوجود غلط مفروضات پر مبنی ہے۔ (ص ۱۸۵-۱۸۶)

یہ اقتباس ذرا لمبا ہو گیا ہے لیکن اسے ہم نے اس لیے نقل کیا ہے کہ جس طرزِ فکر کو بنیاد ٹھہرا کر فاضل مصنف نے مولانا مودودی کے انکار کو غلط قرار دیا ہے اسی میں سب سے بڑا منطقی مغالطہ پایا جاتا ہے۔ یا تو فاضل مصنف کو کھل کر یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ اتباع کے لائق صرف عصری روح اور اُس کے تقاضے ہیں اور ہر وہ چیز جو ماضی سے تعلق رکھتی ہے بیکار ہے یا انہیں یہ بات ماننی چاہیے کہ ہمارے پاس دین کی صورت میں ایسی تعلیمات یا ایسی اقدار حیات ہیں جو ناقابلِ تغیر ہیں اور جن کے مطابق ہمیں عصری تبدیلیوں کو رد یا قبول کرنا چاہیے مولانا مودودی کے طرزِ فکر سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے اور اُس میں کوئی منطقی مغالطہ نہیں کہ وہ اسلام کی ازلی و ابدی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں ہی معیارِ حق سمجھ کر حالات و واقعات کی قدر و قیمت کا تعین کرتے ہیں اُن کا ایمان یہ ہے کہ اسلامی اقدار ناقابلِ تغیر ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا غلط ہے۔ انسان کی خارجی زندگی میں بلا شبہ تغیرات ہوتے رہتے ہیں لیکن ایک صحت مند زندگی کے حفظ و بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ کے دین کے مطابق انہیں رد یا قبول کیا جائے۔ اگر ہم اس صحیح طرزِ فکر کو نظر انداز کر کے دین کے بارے میں کوئی دوسرا طرزِ فکر اختیار کریں گے تو فکر و عمل کی بہت سی الجھنوں میں اپنے آپ کو گرفتار پائیں گے۔

اب ذرا فاضل مصنف کے نظریہ کا جائزہ لیجیے۔ وہ ایک طرف اسلامی تعلیمات کی

عظمت کے قائل ہیں اور مسلمانوں کو اس بات کا مشورہ دیتے ہیں کہ انہیں کلچر کی تشکیل میں قوت و طاقت کے اس لازوال خزانے سے فائدہ اٹھانا چاہیے مگر دوسری طرف اس امر کی بھی تلقین کرتے ہیں کہ اسلام کے اندر عصری تقاضوں کے مطابق تغیر ضروری ہے تاکہ مسلمان فکری اور عملی انتشار سے بچ جائیں۔ بظاہر یہ نظریہ بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اُن کے نزدیک اصل اور فیصلہ کُن چیز کیا ہے، اسلام یا عصری تقاضے؟ اسلام کوئی سیال شئے نہیں جو ہر سانچے میں آسانی ڈھل جاتے۔ وہ اپنا ایک خاص نظامِ فکر اور ایک متعین اسلوبِ حیات رکھتا ہے اور اس بنا پر بدلتے ہوئے حالات و واقعات یا نئے نئے اُبھرنے والے مسائل کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ آپ اگر اسلام کی اس حیثیت کے قائل ہیں تو لازمی طور پر اُن چیزوں کی مخالفت کرنا ہوگی جو خواہ عصری تقاضوں کے لحاظ سے کتنی ضروری ہوں مگر دینی اعتبار سے صحیح نہیں۔ اور اس کے برعکس اگر آپ کی نگاہ میں عصری تقاضے ہی فیصلہ کُن اہمیت کے حامل ہیں تو پھر اسلام کی اہمیت ماضی کی ایک مقدس یادگار کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اس کے اندر تغیر و تبدل کرنے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ اسے یکسر نظر انداز کر کے آگے بڑھا جائے۔ ہمارے نزدیک فاضل مصنف کے اساسی تصورات میں یہی سب سے بڑا منطقی مغالطہ ہے۔ (ع۔ ح)

اصح السیر فی ہدی خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم | تالیف: جناب حکیم ابو البرکات عبد الرؤف صاحب داناپوری۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی۔ قیمت: دس روپیہ۔ ضخامت: ۶۵۶ صفحات۔

سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اردو زبان میں اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، زیر نظر کتاب ان سب میں اختصار، استیعاب اور استناد کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے کہ فاضل مؤلف نے عام سیرت نگاروں سے ہٹ کر اس کتاب میں ایک نئی ترتیب قائم کی ہے یعنی سیرت کو بلحاظ سنین مرتب کرنے کے بجائے۔ دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ حصہ اوّل میں از ولادت تا وفات صرف واقعات درج کر دیئے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ جن ضروری فقہی مسائل کا سیرت کے کسی خاص محل سے خاص تعلق تھا ان کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر فتح مکہ میں اراضی حرم کا حکم، عمرۃ القضاء میں نکاح محرم کی بحث، غزوۂ خیبر اور فتح مکہ میں متعہ کی بحث اور خلافت و امامت کی بحث حجۃ الوداع میں وغیرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمام و عمات اور ان کی اولاد، امہات المومنین اور ان کے انساب اور صحابہ کرام کے آپس کے رشتوں کی تفصیلات بھی دی گئی ہیں۔ مشتبہ اسماء، مشکل الفاظ اور مقامات کا صحیح تلفظ بھی بتایا گیا ہے۔ آغاز میں فاضل مؤلف نے سیرت سے متعلق اہم مباحث اور تاریخ عرب قبل البعثت پر ایک مبسوط مقدمہ سپردِ قلم کیا ہے۔

دوسرے حصے میں فاضل مؤلف کے پیش نظر دلائل النبوہ، معجزات، شمائل اور تعلیمات وغیرہ پیش کرنا تھا مگر شاید یہ حصہ یا تو لکھا ہی نہیں گیا یا لکھا گیا تو شائع نہیں ہوا۔ بہرحال زیرنظر کتاب مندرجۂ بالا مباحث ہی پر مشتمل ہے اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے طالب علم حضرات کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔

عورت اسلامی معاشرے میں | مصنف: مولانا سید جلال الدین انصر عمری۔ ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن: ۶ روپیہ۔ سستا ایڈیشن: ۳ روپیہ ۵ پیسے۔ ضخامت: ۴۵۵ صفحات۔

زیرنظر کتاب میں فاضل مصنف نے اسلامی معاشرے میں عورت کی سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی حیثیت اور اس کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ فاضل مصنف کا اصل مقصود یہ دکھانا ہے کہ اگر کسی معاشرے نے عورت کو اس کا صحیح مقام و مرتبہ دیا ہے تو وہ صرف اسلامی معاشرہ ہے۔ اس کے سوا تمام معاشروں نے خواہ وہ قدیم یونان و روم کا معاشرہ ہو یا جدید یورپ کا معاشرہ اور خواہ وہ ہندو معاشرہ یا عیسائی معاشرہ عورت کو غلط نقطۂ نظر سے دیکھا اور غلط سلوک کیا۔ ہماری رائے میں یہ کتاب اس موضوع پر اچھا تقابلی مطالعہ ہے۔

التحریر فی اصول التفسیر | مؤلف: حضرت مولانا محمد مالک صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم

اسلامیہ ٹنڈو الہ یار۔ ناشر: قرآن محل۔ مقابل مولوی مسافر خانہ۔ کراچی ۱ قیمت: چھ روپیہ ضخامت: ۳۴۲ صفحات

زیر نظر کتاب ان حضرات کی دلچسپی کا باعث ہوگی جو قرآن مجید سے شغف رکھتے ہیں اور ان کا شغف صرف تلاوت تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اس عظیم کتاب کے بارے میں کچھ جاننا بھی چاہتے ہیں۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب میں قرآن مجید کے بارے میں ہمہ اقسام کی معلومات جمع کر دی ہیں۔ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں فضائل قرآن، نزول قرآن، وحی، اقسام وحی، مکی و مدنی آیات، جمع و تدوین قرآن، سورتوں کی ترتیب وغیرہ معلومات جمع کی گئی ہیں۔ دوسرے حصے میں تفسیر اور علوم قرآن سے متعلق مواد جمع کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر فہم قرآن کے موضوع پر یہ ایک اچھی کتاب ہے۔

تاریخ فقہ تالیف: علامہ شیخ محمد خضری بک۔ ترجمہ: مولانا محمد تقی عثمانی و مولانا حبیب احمد ہاشمی۔ ناشر: دار الاشاعت۔ مولوی مسافر خانہ کراچی ۱۔ قیمت: نو روپیہ ضخامت: ۵۹۳ صفحات

اردو زبان کا دامن تاریخ فقہ کے موضوع پر بلند پایہ کتابوں سے خالی ہے۔ دار الاشاعت کراچی کے منتظمین اردو داں حضرات کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کمی کو علامہ خضری بک کی مشہور کتاب تاریخ التشریع الاسلامی کے ترجمے سے پورا کر دیا۔

علامہ خضری بک نے اپنی اس کتاب کو شخصیات کے بجائے زمانوں کے اعتبار سے مرتب کیا ہے اور کل مدت کو چھ ادوار میں تقسیم کر کے فقہ کے ارتقاء کا نقشہ پیش کیا ہے۔ ہر دور کے ممتاز فقہاء، فقہی مکاتب اور کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اگرچہ فاضل مصنف کی بعض آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے تاہم مجموعی طور پر کتاب وقیع اور مفید ہے۔

فاضل مترجمین نے ترجمہ محنت سے کیا ہے لیکن اس میں شگفتگی اور روانی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کتاب کا معیار کتابت و طباعت اچھا ہے البتہ کہیں کہیں اغلاط رہ گئی ہیں۔ اس طرح کی کتابوں میں اغلاط کا رہ جانا بہت کھٹکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ آئندہ ایڈیشن کی تصحیح زیادہ دقت نظر

کے ساتھ کی جاتے ۔

جواہر علوم قرآن | تصنیف : طنطاوی جوہری ۔ترجمہ : عبد الصمد صارم الازہری ۔ناشر : آزاد بک ڈپو اردو بازار ۔لاہور ۔قیمت : چار روپیہ ضخامت : ۲۴۸ صفحات ۔

زیر نظر کتاب مصر کے مشہور فاضل علامہ طنطاوی جوہری الازہری کی کتاب "الناج المرصع بجواہر القرآن والعلوم" کا اردو ترجمہ ہے ۔علامہ طنطاوی ان علماء میں سے ہیں جنہوں نے جدید علوم کا مطالعہ کیا اور دینی علوم کو جدید انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ۔ان کا خاص موضوع جدید سائنسی انکشافات کو قرآن مجید کے مطابق ثابت کرنا تھا ۔یہ کتاب بھی اسی رنگ کی حامل ہے اور خاصی مقبول رہی ہے اور ہمارے ہاں فاضل عربی کے نصاب میں داخل ہے ۔

مخدوم جہانیاں جہاں گشت | مرتبہ جناب محمد ایوب قادری ۔شائع کردہ : ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی وحید آباد کراچی ۱۸ صفحات ۳۴۵ ۔قیمت مجلد سات روپے غیر مجلد ۶ روپے

پاک و ہند میں اسلام کا نور جن مقدس نفوس کے ذریعہ پھیلا اُن میں مخدوم جہانیاں جہاں گشت ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ۔یہ بزرگ بادشاہ محمد بن تغلق اور اُس کے جانشین فیروز شاہ کے ہمعصر تھے اور دونوں ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے ۔ان کے حالات زندگی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ نے ان بزرگوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ۔ صوفیا کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ یہ حضرات دنیا سے ترک تعلق کئے ہوتے تھے لیکن اسلام کی پوری تاریخ اس تاثر کی تردید کرتی ہے ۔مسلمان صوفیا کی عظیم اکثریت نے دین اور ملت اسلامیہ کی بے پناہ خدمت کی اور اپنے جوش عمل سے حکومت کے ایوانوں تک کو ہلا دیا ۔

فاضل مصنف نے کتاب کی ترتیب و تدوین میں بڑی دیدہ وری اور عرق ریزی کا ثبوت دیا ہے ۔کتاب کے آخر میں اس کے ماخذ اور دو مکمل انڈکس بھی درج ہیں ۔

(بقیہ اشارات)

اخلاقی اور دینی مضمرات سے قطعاً ناواقف ہیں اور یورپ کی اندھی تقلید میں بلا سوچے سمجھے اسے اقتدار کے ذریعہ عوام میں پھیلانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ صریح زیادتی ہے۔ ہم نے اوپر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ یہ محض ایک معاشی تدبیر نہیں بلکہ ایک باطل نظریہ حیات کا شاخسانہ ہے۔ اس تحریک کے اپنانے سے اس نظام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے جو خدا پرستی کی اساس پر قیام کیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ تحریک اس نظام حیات کے خلاف ایک سازش ہے جس کے قیام کا ہم نے اپنے آئین اور دستور میں اعلان کیا ہے۔

اگر کوئی صاحب اس تحریک کو پاکستان کے لئے مفید سمجھتے ہیں تو وہ شوق سے اسے اپنے ذاتی وسائل کی مدد سے چلائیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح قرین انصاف نہیں کہ کوئی شخص یا گروہ محض تخت اقتدار سے فائدہ اٹھا کر ایسی باطل تحریکات کو یہاں نشوونما دینے کی کوشش کرے جو اہل ملک کے اساسی تصورات سے مغائر اور ان عزائم کے خلاف کھلے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہوں جن کا اظہار اس ملک کے آئین اور دستور میں موجود ہے۔ یہ ملکی آئین کا احترام نہیں بلکہ اس کی بے حرمتی ہے۔

ہر مسلمان کے لیے قابلِ مطالعہ کتب

محسنِ انسانیت

مؤلفہ: ابوالسلام نعیم صدیقی

- نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیّبہ پر مستند اور جامع کتاب — ایک نئے انداز میں۔
- حضورؐ کی ہمہ گیر شخصیت کا تحریکی نقطۂ نظر سے مطالعہ۔
- پیغمبرانہ بصیرت، تدبّر و حکمت کی آئینہ دار

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۰۰ء۱۵ روپے سستا ایڈیشن ۰۰ء۱۱ روپے

حیاتِ طیّبہ

از: ابو سلیم محمد عبدالحی

- نبی اکرمؐ کی سیرتِ پاک آسان اور عام فہم انداز میں۔
- مستند واقعات، ایمان پرور جذبات سے بھرپور۔
- حضورؐ کی قیادت میں برپا شدہ تحریک کا مختصر مگر جامع نقشہ۔
- ایمان و عمل پر ابھارنے والی ایک بیش قیمت کتاب۔

صفحات ۲۸۰ قیمت ۵۰ء۳ روپے

ختمِ نبوّت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- ختمِ نبوت کے بارے میں ۱۴ صدیوں کے جید علمائے اُمّت کی متفقہ تصریحات۔
- منکرینِ ختمِ نبوت کے اعتراضات کا مدلّل جواب

آفسٹ کی عمدہ کتابت و طباعت

اعلیٰ ایڈیشن خوبصورت سرورق ۶۰ پیسے
سستا ایڈیشن فی نسخہ ۲۰ ″

قادیانی مسئلہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اور اُسکے سیاسی، دینی اور تمدنی پہلو

- پاکستان میں قادیانیت کے اثرات۔
- قادیانی عقائد کا دینی، سیاسی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے جائزہ
- قادیانیت کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب

قیمت مجلّد ۷۵ء۵ روپے
سستا ایڈیشن ۷۵ء۳ ″

مُرتد کی سزا

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامی قانون میں

- اسلامی قانون میں ارتداد کی نوعیت و حیثیت
- اسلام کے ایک اہم قانون کی تشریح مضبوط دلائل کے ساتھ
- مخالفین کے اعتراضات اور اُن کے مسکت و مدلّل جوابات

آفسٹ کی حسین طباعت قیمت ایک روپیہ

تجدید و احیائے دین

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- تجدیدِ دین کی حقیقت اور اس کی اہمیت
- مجددینِ ملّت کے کارناموں کا تحقیقی مطالعہ
- تجدد اور تجدید کا فرق۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت

قیمت مجلد ۷۵ء۲ روپے سستا ایڈیشن ۷۵ء۱ روپے

فون: ۶۸۳۴۱

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ○ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ ○ لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

اسلام کے نظامِ سیاسی پر معرکہ آرا تصانیف

اسلامی ریاست

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر۔
- علماء، طلباء، قانون و سیاست کے لیے ایک تجزیۂ علم

قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

سنت کی آئینی حیثیت

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- سنت کیا ہے؟
- سنتِ نبوی کا دین میں صحیح مقام کیا ہے؟
- سنتِ نبوی کی صحت و حفاظت کا ثبوت
- منکرینِ حدیث و سنت کا مسکت و مدلل جواب

آفسٹ کی حسین کتابت و طباعت قیمت ۸/۵۰ روپے

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حالت کا نقشہ۔
- مسلمانانِ ہند کیلیے صحیح نصب العین اور طریقۂ کار کی نشاندہی۔
- برصغیر ہند و پاک کی پچاس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

حسین کتابت و طباعت، رنگین ڈسٹ کور قیمت صرف ۱۰/- روپے

الجہاد فی الاسلام

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلل و مستند کتاب
- اسلامی قوانین جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانین جنگ سے موازنہ
- اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۷/۵۰ روپے

نظامِ اسلامی — مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

مرتبہ: مولانا خلیل حامدی صاحب

- مراکش سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا مجموعہ۔
- ملتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب و عمل
- معاندینِ اسلام کا بھرپور اور مدلل جواب۔

۵۰۰ صفحات سے زائد۔ قیمت صرف ۶/۵۰ روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟
- اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلل تفصیلی بحث

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۲۵ روپے
سستا ۳/۰۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور